کشمیر بزمِ ادب کا ترجمان

2

گُل ریز

(2)

بانی

مرزا عارف

نظر و ترتیب

امین کامل

مدیر و پبلشر

محمد صدیق کبروی

جلد ۱ • نمبر ۲

دسمبر ۱۹۵۲ء

سالانہ چندہ ۵ روپے

فی پرچہ ۸ آنے

ماہنامہ "گُل ریز" لال چوک سرینگر

(کشمیر)

مندرجات

یہ مہینہ!	اداریہ	۲
رسول میر — تعارفی تبصرہ	امین کامل	۳
یہ گیت کس کا ہے؟	—	۸
حضرت شیخ العالم شیخ نور الدین رح	مرزا عارف	۹
کلام شیخ العالم رح	—	۱۴
فردوسیٔ کشمیر — وہاب پرے	پروفیسر حاجنی	۱۹
کشمیر میں فنِ رقاصی	پنڈت ناظر	۲۲
عبد الاحد نادم	ابو ریاض	۲۵
رسول میر سس کُوں (نظم)	مرزا عارف	۲۹
رسول میر اور چمن (نظم)	فاضل کاشمیری	۳۰
پیغمبرِ شاعری (نظم)	برق	۳۲
غزل	محی الدین نواز	۳۳
دو غزلیں (اردو)	حامدی و افسر	۳۴
مہمان (افسانہ)	پریم ناتھ پردیسی	۳۵
گوشۂ احباب	—	۳۹
لکھنے والے	مدیر	۴۰

اداریہ

یہ مہینہ

۵ ر اکتوبر کی رات کو "کشمیر بزم ادب" نے چرار شریف میں حضرت شیخ نور الدین نورانی رحمتہ اللہ علیہ کے مزارِ مقدس کے وسیع احاطے میں ایک تاریخی مشاعرہ منعقد کیا جس میں ۲۵ ہزار کے قریب عوام نے شرکت کی۔ شیخ نور الدین نورانی رحمتہ اللہ علیہ آج سے کوئی چھ سو سال قبل ہمارے ادب کے ہراول دستے میں نظر آتے ہیں اور جب سے پہلی بار اُن کی شاعرانہ عظمت کے احترام میں خراجِ عقیدت پیش کیا گیا۔

۲۴ ر اکتوبر کا دِن بھی ہمارے ملک کی ادبی تاریخ میں ہمیشہ کے لئے زندہ رہے گا۔ کیونکہ اس روز "کشمیر بزم ادب" کے اہتمام سے کشمیری زبان کے عظیم فن کار اور شاعر رسول میر شاہ آبادی کا دِن شان دار پیمانے پر منایا گیا۔ اِس سلسلے میں خالدِ کشمیر بخشی غلام محمد کی ادیب نوازی اور اُن تھک کاوشیں بہت قابلِ قدر ہیں۔

"گل ریز" کے پہلے شمارہ کا ہر طرف سے جو نُمایاں خیر مقدم ہوا اُس سے ہماری ہمّت بہت کچھ بندھ گئی ہے۔ نہ صرف بہت سے تعریفی خطوط موصول ہو رہے ہیں بلکہ اِس کی خریداری میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

ہمیں اُمید ہے کہ کشمیری علم و ادب میں دلچسپی لینے والا ہر وطن دوست اس کی خریداری بڑھانے میں زیادہ سے زیادہ کوشاں رہے گا۔ خریداری کے بڑھنے سے نہ صرف اس کی ضخامت میں اضافہ ہوگا بلکہ اس کو اور بھی جاذبِ نظر بنانے پر توجّہ دی جائے گی جس کا احساس اب کی مرتبہ آپ کر رہے ہوں گے۔ اپنی اہمیت اور تاریخی دستاویز ہونے کے لحاظ سے چاہیئے تو یہ تھا کہ یہ جریدہ ہر کشمیری گھر میں پہنچ جاتے، پھر بھی اس ملک کے ہر گاؤں میں اِس کا ایک ایک پرچہ پہنچانے میں ہر وطن دوست کو بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہیئے۔

یہ ایک قومی فریضہ ہے جو ہم سب کو نبھانا ہے!

(مُدیر)

امین کامل

رسول میر

تعارفی تبصرہ

اُن اُونچے نیچے برف پوش پہاڑوں سے گھری ہوئی ہماری حسین و شاداب وادی میں آج سے کوئی ڈیڑھ ہزار سال پہلے آریاؤں نے اپنے قدم جمائے اور سنسکرت زبان کو یہاں کی راج بھاشا کا درجہ دیا۔ اور چودھویں صدی عیسوی تک جب کہ ہندوؤں کے دورِ حکومت کا خاتمہ ہوا، ہماری زبان کو سر اُٹھانے اور آگے بڑھنے کا موقع ملا۔ پٹھانوں اور مغلوں کی آمد کے ساتھ ہی فارسی علم و ادب کی سرمست گھٹائیں ہماری زبان کے آکاش پر جھومنے لگیں۔ یہ غلبہ اور پھیلاؤ اس قدر شدید تھا کہ اُنیسویں صدی کے اواخر تک ہمارا تعلیم یافتہ طبقہ کشمیری میں شعر کہنا یا پڑھنا باعث عار اور موجب تحقیر سمجھتا رہا۔ لے دے کے یہ تخلیقات صرف دیہاتوں اور شہروں میں بسنے والے اَن پڑھ عوام تک محدود رہ گئیں۔ فارسی کے اس غلبہ ہی کا نتیجہ تھا کہ آج سے قریباً سو (۱۰۰) سال پہلے تک کشمیری میں فنِ شعر گوئی صرف عورتوں کے ہاتھوں پروان چڑھتا رہا۔ مردوں پر حکمرانوں کی زبان مسلّط ہو گئی تھی اور وہ اسی میں طبع آزمائی کیا کرتے تھے۔ اس دوران میں جو چند ایک گنے چنے مرد شاعر ہوئے ہیں وہ سب کے سب صوفی تھے جو دربارِ شاہی سے دُور عوام اور اُن کی زندگی سے قریب رہتے تھے۔

ڈوگروں کے ہاتھ میں حکومت کی باگ ڈور آتے ہی ہماری زبان ایک طویل اور گہری نیند سے چونک اُٹھی، کیونکہ اُن کی اپنی زبان اس قابل نہ تھی کہ وہ راج بھاشا کے مقام کو چھو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں سے ہم مردوں کو اپنی زبان کی طرف متوجہ پاتے ہیں، اگرچہ نئے تعلیم یافتہ طبقے کا جھکاؤ زیادہ تر اُردو کی طرف رہا۔ جو شاعر اپنی زبان کی طرف مائل ہوئے وہ اُردو سے بے بہرہ لیکن فارسی زبان کے جو اب راج بھاشا کے امتیازی درجہ سے محروم ہو چکی تھی، اچھے ماہر تھے۔ اُردو کے اس بڑھتے ہوئے اثر کی چھاپ اس دَور کی ساری شاعری میں نمایاں طور پر جھلکتی ہے۔ چناں چہ محمود گامی کے یہاں، جو اس دَور کا بانی تھا، ہمیں ایسے اشعار بھی ملتے ہیں ؎

ہے داد ہے بیداد کہ دل لے گیا سجن ہے دیکھو تم ہمارے ساتھ کیا کیا سجن

مرحورہ نیونم ژدرہ دل چھم ہوولہ نہز سوی نار

ہم کس کو پکاریں، کس راستے گیا سجن

المنۃ للہ کہ میرا یار اچھا ہے — وزماہ رُخاں، ماہِ من بسیار اچھا ہے

جانانہ زمیخانہ چو مستانہ بر آمد — اکیلا ہے دیکھو دیکھو کہ تمہارا اچھا ہے

رسول میر کے یہاں بھی اس کے ہلکے ہلکے عکس ملتے ہیں۔

کیاہ جامہ لال رنگایا — بنگال سے منگایا

سر ماف جھال سر پہ — ظالم عجب ستم گر

ژاں وزنکن چھی جاے ہانکل — دِل چھہ شانگل ولہ کلاوے

آج مجھ کو لِہ جاماتی — بوزلتی وول چون آم

اُردو کے اس اثر کے باوجود یہ دَور ہمارے کلاسیکل ادب کا سنہری زمانہ کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اس زمانے میں بڑے بڑے فن کاروں کے ہاتھوں وسیع پیمانے پر غزلیں، گیت (وچن) مثنویاں تخلیق ہوئیں۔

ہمارا ادب تیرھویں صدی عیسوی میں للہ ایشری کے "واکھوں" (قطعات) سے شروع ہوتا ہے۔ یہ ہمارے ادب کی خوش قسمتی تھی کہ اس کی مجذوبیت نے ہم پر علم و ادب کے دروازے کھول دیئے اور ایک وسیع و ارفع عمارت کی بنیاد ڈالی جس پر بعد میں مختلف وقتوں پر بڑے بڑے ادبی معماروں نے وہ وہ گل کاری کی جسے دیکھ کر آج ہماری نگاہیں چکاچوند ہو جاتی ہیں۔

للہ ایشری اور اس کے قریبی ہم عصر شیخ نور الدین نورانی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد سولھویں صدی تک ہمارا ادب ایک دھندلکے میں کھو جاتا ہے اور پھر سحر طراز شاعرہ حبہ خاتون جنم پاتی ہے جو اپنے سے قبل کی متصوفانہ شاعری کے راستے سے ہٹ کر رومانوی رنگ آمیزی سے ہمارے ادب میں ایک نئے دَور کا آغاز کرتی ہے۔ حبہ خاتون کے بعد اٹھارہویں صدی تک ہماری شاعری جن مراحل سے گذرتی اور ترقی کے زینے طے کرتی ہے اس سے ہم پورے طور باخبر نہیں۔ یہ سارا زمانہ بہت حد تک ہماری نظروں سے اوجھل رہنے کے بعد سب سے پہلا شاعر جو ہمارے سامنے آتا ہے محمود گامی ہے۔

محمود گامی نے آج سے کوئی ڈیڑھ سو (۱۵۰) سال پہلے جنم پا کر ایک نئے دَور کی ابتدا اپنی غزلوں، گیتوں اور مثنویوں سے کی اور اسی کو کمال بھی بخشا۔ روانی، فصاحت، جذبات و خیال کی سادگی، دیہاتی عوام کا روزمرہ، الفاظ کی مٹھاس اور درد بھرے بول ان کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔ ان ہی کے تلامذہ میں سے فدائے سخن رسول میر بھی تھے۔

ان کی زندگی سے متعلق بہت کم حالات اس وقت تک دریافت ہو چکے ہیں۔ جو کچھ ہم تک پہنچا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ آپ سہہ پورہ کے گاؤں ڈورو شاہ آباد میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد میر میداں گے نمبردار تھے۔ اس زمانے میں مکتبوں کا رواج تھا، جہاں مروجہ فارسی علم و ادب کی تعلیم دی جاتی تھی۔ آپ کو بھی اسی قسم کے ایک مکتب میں بھیج دیا گیا جہاں ایک کشمیری پنڈت لڑکی سے جس کا نام کُنگی تھا اور آپ کی ہم درس تھی، دل لگی رہی، جس نے رفتہ رفتہ گہرے معاشقہ کی صورت اختیار کی۔ جب کُنگی سن بلوغت کو پہنچی تو اس کی شادی اسی علاقے کے کسی گھرانے میں رچائی گئی۔ جدائی کے اس صدمے سے آپ کے دل سے ایک ہوک اٹھی جو شعر کے قالب میں ڈھل گئی اور یہی آپ کا پہلا گیت تھا:-

ہے مست شراب عاشق جنگم — کُنگی ژہ ہاوتے پان
شراب چاوک کانگ دینگی — کُنگی ژہ ہاوتے پان

(تیری جدائی میں تیرے پریم کا رسیا نڈھال ہے۔ اے کُنگی تو اپنے درشن دکھا! تو اس کو شراب پلا اور اس کا غم دور کر۔ اے کُنگی تو اپنے درشن دکھا!)

ہر قدم قدم پر ارزان — وندے پوگل تہ پرستان
بہار ژٹ ندرت پہاڑ ڈینگی — کُنگی ژہ ہاوتے پان

(تیرے انتظار میں میرا دل بھسم ہو گیا۔ تجھ پر پوگل اور پرستان (ایک علاقہ) قربان ہوں۔ میں پہاڑ کی ترائی میں بہار میں تیری باٹ دیکھتا رہوں گا۔ اے کُنگی تو اپنے درشن دکھا!)

پہلی کوشش ہونے کے باوجود اظہار و خیال کی سادگی اور بیان کی برجستگی میں یہ گیت محمود گامی کی غزلوں سے جا ملتا ہے۔

کشمیر میں رواج ہے کہ لڑکی کی شادی ہونے اور اس کے سسرال میں رہنے کے چند دنوں بعد لڑکی کے میکے والے دونوں میاں بیوی کو اپنے گھر لا کر پانچ سات دن مہمان نوازی کرتے ہیں۔ اسی قومی رسم کے مطابق کُنگی بھی اپنے میکے آئی۔ حسن

اتفاق سے اُس روز گاؤں میں کوئی تیوہار تھا۔ اُس زمانے میں "رَف" (تیوہاری گیت) گانے کا طریقہ یہ تھا کہ مردوں اور عورتوں کی دو الگ الگ ٹولیاں بن جاتی تھیں۔ ایک ٹولی گیت کا پہلا بول اور دوسری ٹولی دوسرا بول گایا کرتی تھی۔ میر صاحب کے اصرار پر کنگی بھی اس میں شریک ہوئی اور آپ نے اس موقعہ کے لئے اپنا یہ مشہور گیت تخلیق کیا ؎

شُوبہ خابِنچ چانہِ پُوزایہ لو لو
رِندہ پُوشہ مال گِنِدنے درایہ لو لو

(مُبارک ہے وہ جو اس کی پُوجا پرستش کرتا ہے۔ پھولوں ایسی چنچل ناری آج کھیلنے کو چلی رہی)

دازہ ہُنز یانہ نازکیاہ چھ اُنہ ہِ گردن
میانہِ بُڈہ پایہِ چشمہ بدہ نِشہ رچھتن
گژھہ کیاہ کم چانہِ بارگا بیہ لو لو
رِندہ پوشہ مال گِندنے درایہ لو لو

(اس ماہ ہندو رانی کی گردن مادہ راج ہنس ایسی ہے۔ اسے خدا اس کو کہیں کسی کی آنکھ نہ لگے۔ تیری قدرت کے خزانے میں اس سے کوئی کمی تو نہیں ہوگی۔ پھولوں ایسی چنچل ناری کھیلنے کو چلی رہی)

مائکے میں گئے چھٹے چند ایک دنوں تک ٹھہرنے کے بعد کنگی اپنے سسرال واپس چلی گئی۔ میر صاحب اب کی بار اُس کی جُدائی کی تاب نہ لا سکے اور اُن پر مجذوبانہ کیفیت طاری ہوئی اور آٹھ نو سال تک اپنے آپ سے وارفتہ و بے خبر رہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس مجذوبانہ حالت میں ایک رات جب کہ آکاش پر چودھویں کا چاند اپنی نورانی کرنوں سے تاریکی کا پردہ پھاڑ کر دُنیا کو ٹھنڈک اور روشنی پہنچا رہا تھا، آپ ویری ناگ کے چشمے کے کنارے بیٹھ گئے۔ چشمے میں چاند کے عکس کو دیکھ کر آپ کے حساس دل پر ایک نیا ردِ عمل شروع ہوا، اور آپ نے سوچا کہ جس چاند کو آپ چشمے میں چمکتا ہوا دیکھ رہے ہیں وہ آسمان کے اُس چاند کا جو کہ حقیقت ہے ایک دھندلے پرتو کے سوا اور کوئی اصلیت نہیں رکھتا۔ دماغ میں خیالوں کا ٹکراؤ ہوا اور مجذوبیت نے پیچھے ہٹ کر دوبارہ ہوش و حواس کو آگے آنے کے لئے راستہ چھوڑ دیا۔ اُس وقت آپ نے نو (۹) سال کے طویل سکوت کے بعد یہ مشہور نعتیہ غزل کہی ؎

ازِ وُچھ مہ دِلبر — الحمد للہ
دوتِم سُو بہ دَر — الحمد للہ

(خدا کا شکر ہے کہ آج میں نے اپنے دوست کو پالیا۔ خدا کا شکر ہے کہ آج وہ میری چوکھٹ پر آگیا)

اس کے بعد آپ نے ڈورو کی خانقاہ میں مستقل طور پر گوشہ نشینی اختیار کی اور اکثر اُسی کھڑکی میں بیٹھا کرتے جس کے سامنے آج آپ زیرِ زمین آرام فرما ہیں۔ اس خلوت نشینی کے ایام میں بسا اوقات حضرت شاہ ہمدان رحمتہ اللہ علیہ کی زیارت کی تقریب پر آپ سرینگر آیا کرتے اور آثار شریف حضرت بل سے ہو کر واپس ڈورو جایا کرتے تھے۔

آپ کی پیدائش اور راہیٔ عدم بقا ہونے کی تاریخیں ابھی تک صحیح طور پر دریافت نہیں ہو سکی ہیں۔ آپ بلند قامت، تنومند، خوش رُو اور خوش پوش تھے، مونچھیں لمبی لمبی تھیں۔ جب کسی کی طرف آنکھ اُٹھاتے تو اس کے دل کی گہرائی کو چھو جاتے تھے۔ چہرے سے وجاہت، خلوص اور متانت ٹپکتی تھی۔ آپ نے ساٹھ (۶۰) سال کے لگ بھگ عمر پائی۔

ارضِ کشمیر میں شاہ آباد کا علاقہ تاریخی اہمیت رکھتا ہے، کیونکہ یہ علاقہ کشمیر میں سب سے پہلے آباد ہوا، اور اس لحاظ سے ہمارے تہذیب و تمدن کا بھی گہوارہ رہا۔ نیلمت پران جو کشمیریوں کے قدیمی تمدن کا آئینہ دار ہے اسی علاقے میں ترتیب پایا۔

اِس سرزمین نے کئی شاعروں اور فن کاروں کو جنم دیا جن میں سے محمود گامی، رسول میر اور میر سعد اللہ ہماری تین جلیل القدر ادبی شخصیتیں ہیں
کشمیری گیتوں اور غزلوں کی روایات محمود گامی سے شروع ہوئیں اور رسول میر نے ان کو اتنا اُبھارا اور بڑھایا کہ خود امام اور امیر کا مقام حاصل کیا۔ اُنہوں نے غزل کو دو چیزیں عطا کیں، ایک طرز بیان کی سادگی اور دوسرے لازوال محبت کا سوز' اور یہی غزل کی دو بڑی خوبیاں ہیں۔ ان کے جذبات و تاثرات اور ان کے خیالات و احساسات نہ صرف ان کے اپنے داخلی واردات کا آئینہ ہیں بلکہ وہ خارجی کیفیات کی بھی برابر عکاسی کرتے ہیں۔ اگرچہ غزل میں کسی خارجی حقیقت کو پڑھنے کی کوشش کرنا آسان نہیں جس کی وجہ اس صنف کی اپنی حد بندیاں ہیں۔ اُنہوں نے لازوال خلوص، لافانی محبت اور لامتناہی زندگی کے سوز کی ترجمانی کر کے ایک زندہ، متحرک اور پائندہ ادب کی بنیادیں اُستوار کیں۔ یہ اُن لوگوں میں سے نہیں تھے جو صرف موزونیٔ طبع کی وجہ سے یا دوسروں کی داد و تحسین سُننے کی خاطر شعر کہتے تھے بلکہ یہ اُن میں سے تھے جو ہمہ تن شعر میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ان کی زندگی ایک "غزل" تھی اور اُن کا یہ دعوے تعلّی نہیں، ایک حقیقت تھا۔

رسول مشتاق مشہور آفاق
نادر سخن گو، سبحان اللہ!

ہماری شاعری کی محفل میں ان کی یہ "نادر سخن گوئی" آج تک قائم اور مُسلّم ہے۔ چناں چہ مہجور بھی اپنے رُوپ میں رسول میر کو جلوہ فرما دیکھ کر فخر کرتے ہیں ؎

یتھ دردہ صورژ پردہ ژٹیتھ گو رسول میر
مہجور لاگِتھ آدمیہ دوبارہ آئی روز

(محبت کے اس گنجینۂ راز کے پردے رسول میر نے پھاڑے تھے، آج اے دوست اُس نے مہجور کے رُوپ میں دوبارہ جنم لیا)۔

میر صاحب کے پیرایۂ بیان میں دِل کشی کے ساتھ تازگی ہے۔ زبان کی صفائی کے ساتھ اداۓ مطالب میں شگفتگی ہے سلاست و تاثیر کے ساتھ خیال کی بلند پروازی اور مضامین کی جدّت بھی ہے۔ کلام کا بیشتر حصہ رومانوی اور غنائی انداز میں ہے جو صحت مند بھی ہے اور جان دار بھی۔ جہاں کہیں متصوّفانہ رنگ اختیار کیا ہے اُس کو بھی ایسی رومانوی صورتوں (IMAGES) میں پیش کیا ہے کہ سُننے والے کانوں کو نہ ہی وہ گراں گزرتا ہے اور نہ ہی اُس کے پھیکے پن کا احساس ہوتا ہے۔

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ میر صاحب کے کلام میں فارسیت کی چھاپ زیادہ ہے۔ یہ صحیح ہے، مگر یہ بات اُس دور کے تمام شاعروں میں یکساں طور پر پائی جاتی ہے۔ عزیز اللہ حقانی کے یہاں، جو اس سلسلے کی آخری کڑی تھی، فارسی الفاظ اور تراکیب کی بھرمار اس قدر شدید ہو گئی تھی کہ ایک عام کشمیری کے لئے اس کے اشعار کا سمجھنا ایک گونہ ناممکن ہو گیا تھا۔

میر صاحب کا کلام تو اس کے مقابلہ میں بالکل صاف اور سُتھرا ہے، جس کی فصاحت اور سلاست کو متاخرین چھو نہیں سکے ہیں۔ آج تک اُن کی جو غزلیں چھپ چکی ہیں وہ سَو ایک کے قریب ہیں۔ باقی کلام نایاب تھا۔ اب ان کا مکمل دیوان اور اس کے ساتھ ہی ایک مثنوی "زیبا نگار" بھی دست یاب ہونے کے امکانات پیدا ہو گئے ہیں۔

کس قدر عجیب اتفاق ہے کہ سرتاج شعرائے اُردو میر تقی میر بھی "میر" تھا اور اُس نے بھی اُردو غزل کو وہی کچھ دیا جو ہمیں رسول میر نے عطا کیا ہے۔ دونوں میں اتنی قریبی مماثلت ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

بعض لوگوں میں جن کا شعور ابھی پختہ نہیں ہو چکا ہوتا ہے، یہ اُپج ہوتا ہے کہ وہ ہر شاعر کے کلام میں زمان و ماحول کو نظر انداز کر کے سیاسی اور معاشی مسائل سے متعلق اس کے ردِ عمل کو ڈھونڈنے کی سعی کرتے ہیں اور جب وہ اس چیز کے خد و خال واضح اور نمایاں صورت میں نہیں دیکھ پاتے تو اپنی تنگ نظری کو کوسنے کے بجائے اُس شاعر پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ ایسے

اس سرزمین نے کئی شاعروں اور فن کاروں کو جنم دیا جن میں سے محمود گامی، رسول میر اور میر سعد اللہ ہماری تین جلیل القدر ادبی شخصیتیں ہیں۔ کشمیری گیتوں اور غزلوں کی روایات محمود گامی سے شروع ہوئیں اور رسول میر نے ان کو اتنا ابھارا اور بڑھایا کہ خود امام اور امیر کا مقام حاصل کیا۔ انہوں نے غزل کو دو چیزیں عطا کیں، ایک طرزِ بیان کی سادگی اور دوسرے لازوال محبت کا سوز، اور یہی غزل کی دو بڑی خوبیاں ہیں۔ ان کے جذبات و تاثرات اور ان کے خیالات و احساسات نہ صرف ان کے اپنے داخلی واردات کا آئینہ ہیں بلکہ وہ خارجی کیفیات کی بھی برابر عکاسی کرتے ہیں۔ اگرچہ غزل میں کسی خارجی حقیقت کو پڑھنے کی کوشش کرنا آسان نہیں جس کی وجہ اس صنف کی اپنی حدبندیاں ہیں۔ انہوں نے لازوال خلوص، لافانی محبت اور لامتناہی زندگی کے سوز کی ترجمانی کرکے ایک زندہ، متحرک اور پائندہ ادب کی بنیادیں استوار کیں۔ یہ اُن لوگوں میں سے نہیں تھے جو صرف موزونیٔ طبع کی وجہ سے یا دوسروں کی داد و تحسین سننے کی خاطر شعر کہتے تھے بلکہ یہ اُن میں سے تھے جو ہمہ تن شعر میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ان کی زندگی ایک "غزل" تھی اور اُن کا یہ دعوےٰ تعلّی نہیں، ایک حقیقت تھا۔

رسول مشتاق مشہور آفاق
نادر سخن گو، سبحان اللہ!

ہماری شاعری کی محفل میں ان کی یہ "نادر سخن گوئی" آج تک قائم اور مسلّم ہے۔ چناں چہ مہجور بھی اپنے رُوپ میں رسول میر کو جلوہ فرما دیکھ کر فخر کرتے ہیں ؎

یتھ دردہ صورژ پردہ ژٹتھ گو رسول میر
مہجور لاگتھ آو میہ دوبارہ اَتی روز

(محبت کے اس گنجینۂ راز کے پردے رسول میر نے پھاڑے تھے، آج اے دوست اُس نے مہجور کے رُوپ میں دوبارہ جنم لیا)۔

میر صاحب کے پیرایۂ بیان میں دل کشی کے ساتھ تازگی ہے۔ زبان کی صفائی کے ساتھ ادائے مطالب میں شگفتگی ہے سلاست و تاثیر کے ساتھ خیال کی بلند پروازی اور مضامین کی جدّت بھی ہے۔ کلام کا بیشتر حصہ رومانوی اور غنائی انداز میں ہے جو صحت مند بھی ہے اور جان دار بھی۔ جہاں کہیں متصوفانہ رنگ اختیار کیا ہے اُس کو بھی ایسی رومانوی صورتوں (IMAGES) میں پیش کیا ہے کہ سننے والے کانوں کو نہ ہی وہ گراں گذرتا ہے اور نہ ہی اُس کے پھیکے پن کا احساس ہوتا ہے۔

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ میر صاحب کے کلام میں فارسیت کی چھاپ زیادہ ہے۔ یہ صحیح ہے، مگر یہ بات اُس دَور کے تمام شاعروں میں یکساں طور پر پائی جاتی ہے۔ عزیز اللہ حقانی کے یہاں، جو اس سلسلے کی آخری کڑی تھی، فارسی الفاظ اور تراکیب کی بھرمار اس قدر شدید ہوگئی تھی کہ ایک عام کشمیری کے لئے اس کے اشعار کا سمجھنا ایک گونہ ناممکن ہوگیا تھا۔

میر صاحب کا کلام تو اس کے مقابلہ میں بالکل صاف اور ستھرا ہے، جس کی فصاحت اور سلاست کو متاخرین چھو نہیں سکے ہیں۔ آج تک اُن کی جو غزلیں چھپ چکی ہیں وہ سو ایک کے قریب ہیں۔ باقی کلام نایاب تھا۔ اب ان کا مکمل دیوان اور اس کے ساتھ ہی ایک مثنوی "زیبا نگار" بھی دست یاب ہونے کے امکانات پیدا ہوگئے ہیں۔

کس قدر عجیب اتفاق ہے کہ سرتاج شعرائے اُردو میر تقی میر بھی "میر" تھا اور اُس نے بھی اُردو غزل کو وہی کچھ دیا جو ہمیں رسول میر نے عطا کیا ہے۔ دونوں میں اتنی قریبی مماثلت ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔

بعض لوگوں میں جن کا شعور ابھی پختہ نہیں ہو چکا ہوتا ہے، یہ اُپج ہوتا ہے کہ وہ ہر شاعر کے کلام میں زمان و ماحول کو نظر انداز کرکے سیاسی اور معاشی مسائل سے متعلق اس کے ردِّ عمل کو ڈھونڈنے کی سعی کرتے ہیں اور جب وہ اس چیز کے خد و خال واضح اور نمایاں صورت میں نہیں دیکھ پاتے تو اپنی تنگ نظری کو کوسنے کے بجائے اُس شاعر پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ ایسے

لوگ رسول میر کی شاعری کو پڑھ کر مایوس ضرور ہوں گے۔ کیونکہ اُس کے یہاں صرف حُسن و عشق کے نغمے ہیں اور رومانوی خیال بندی اور رنگ آفرینی ہے۔ مگر جب وہ اس بات پر سنجیدگی سے دھیان دیں گے کہ رسول میر آج سے کوئی ساٹھ ستر برس پہلے ہو گزرا ہے جب کہ عوام کا سیاسی شعور ابھی گہری نیند میں تھا، جب کہ پیچیدہ متصوّفانہ شاعری سارے ادبی ماحول پر چھائی ہوئی تھی، جب کہ صدیوں کا پیدا کیا ہوا "جنسی امتیاز" پُوری قوّت کے ساتھ کارفرما تھا۔ تو وہ صفائی سے دیکھ لیں گے کہ اُس کے حُسن اور عشق کے ترانے حیاتِ انسانی کو آگے بڑھانے میں اور ہماری شاعری میں نئی زندگی اور حُسن کی رُوح پھونکنے میں پیش پیش رہے ہیں۔

رسول میر نے اپنے دِل کا سوز اِس بچے تلے انداز میں اور اس سلجھے ہوئے رنگین پیرایہ میں اپنے محبوب کے کانوں تک غزلوں اور گیتوں کی شکل میں پہنچایا کہ آج تک لوگ ذوق و شوق سے اس داستان کو پڑھتے اور مزے لیتے ہیں اور جب تک کشمیری زبان کا آفتاب جگمگاتا رہے گا، اسی طرح پڑھا جائے گا۔

رسول سوزِ دِل وَنہ ہس بوزِہ نا
پت بر وُنتھ روزِہ افسانے وسے

(رسول اپنے دِل کا سوز تیرے سامنے رکھتا ہے اے محبوب! تاکہ آنے والے زمانے میں یہ داستان زندہ جاوید رہے)

خراجِ عقیدت

"جب غلامی کی دیواریں گِر گئیں۔ تو سب سے پہلے قوم کا فِکر آزاد ہوا۔ اس نے اپنے ماضی کی طرف ایک نظر ڈالی۔ اُسے مٹی کا ایک انبار دکھائی دیا، جس میں جا بجا کرنیں تھیں جو اس خاکِ تیرہ کو روشن کر رہی تھیں۔ یہ موتی تھے جو گُم نامی کی گرد میں اٹے ہوئے تھے۔ اُس نے ایک کو اُٹھا لیا۔ اُسے رگڑا تو وہ لعلِ شب چراغ نِکلا۔ دوسرا اُٹھایا۔ اسے جھاڑا تو وہ نُور کی طرح روشن تھا۔ اُس کی ہمّت بڑھ گئی۔ اور ان تمام ڈوبے ہوئے موتیوں کو نکالنے پہ کمربستہ ہوئی۔ اپنے شاعروں، فن کاروں، صنعت گروں اور عالموں کو گُم نامی کے غاروں سے نکال کر دُنیا کے سامنے کرنے کا راز یہی ہے جس کا بیڑا کشمیر کی آزاد قوم نے آزاد ہوتے ہی اُٹھا لیا۔"

بخشی غلام محمد

ایک استفسار

یہ گیت کِس کا ہے؟

ہمارے تحقیقی ادارہ نے جب کشمیر کی سولھویں صدی کی مشہور شاعرہ حبہ خاتون کا بہت سارا کلام دستیاب کیا جو ابھی تک ہماری نظروں سے اوجھل تھا تو اس میں "ژہ کیاہ گیہ پہ میانِ دئی" (تجھے میری نفرت کیوں ہوئی اے محبوب!) والا گیت شامل نہ پایا۔ یہ گیت آج کل حبہ خاتون سے منسوب ہے اور اس درجہ شہرت و رواج پا گیا ہے کہ شام ہوتے ہی ہمارے شہر کے گلی کوچوں میں فلمی گانوں کے ساتھ ساتھ اس کی گونج بھی دیر تک سنائی دیتی ہے۔

ہمارے تحقیقی ادارہ نے جب اُن لوگوں سے جو کہ اس سلسلے میں اس کے ماخذ ہیں، استفسار کیا تو اُن لوگوں نے بتایا کہ یہ گیت حبہ خاتون کا نہیں بلکہ کریم ناؔئد کا ہے اور آج سے کوئی چھتیس (۳۶) برس پہلے وہ اس گیت کو مقطع میں اُسی کے نام کے ساتھ گایا کرتے تھے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ اُن کا چچا جس کی عمر سَو (۱۰۰) برس کے قریب تھی، کریم ناؔئد ہی سے اس کو منسوب کرتا تھا۔ حبہ خاتون سے اس کو متعلق کرنے کا کبھی کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوا تھا۔ گیت کا مقطع اصل میں یوں ہے:۔

کریم ناؔئد چھُو افسوس کھیوان • کرُمے نہ زانہہ بندہ گی

کریم ناؔئد جس کا نام تک ہماری ادبی تاریخ میں نہیں ملتا، پانپور کا رہنے والا تھا۔ اس کا ایک بیٹا صمد ناؔئد تھا اور وہ بھی شعر کہا کرتا تھا۔ کریم ناؔئد کا زمانہ ہمارے ان دوستوں کے عندیے میں حبہ خاتون کے بہت بعد کا ہے۔ چنانچہ اُنہوں نے ہمیں اس کے دو ایک گیت اور بھی سنائے جن سے اُن کے اس خیال کو بہت کچھ تقویت ملتی ہے۔

ہمارے قارئین میں سے جن دوستوں کو اس سے اختلاف ہو وہ اپنے اختلاف اور اس کی وجوہات اگر ہمیں لکھ کر بھیج دیں تو ہم اس کو شائع کرنے میں بھاری مسرت محسوس کریں گے۔ گیت کا پہلا بول ہے ؎

ژہ کمیو سوپنہِ میانہِ برم دِتھ نیونکھو

ژہ کیاہ گیہ پہ میانِ دئی

ژکھ تراوُہ دئی ملالہ وُندہ چھوٗری ایوان

ژہ کیاہ گیہ پہ میانِ دئی

(میری کون سی ایسی سوکن نے تجھے فریب سے اپنا لیا ہے۔ تجھے میری نفرت کیوں ہوئی اے محبوب!
کیا تیرا دل یہ گوارا نہیں کرتا کہ تُو یہ غصّہ و رنجش چھوڑ دے۔ تجھے میری نفرت کیوں ہوئی اے محبوب!)

مرزا عارف

نومبر ۱۹۱۰ میں پیدا ہوئے – علی گڈھ یونیورسٹی سے ایم-ایس سی کی ڈگری حاصل کی – ۱۹۳۹ سے اپنی تمام تر کاوشیں کشمیری زبان میں زندگی کی روح پھونکنے سے وابستہ رکھیں – ۱۹۴۵ میں کشمیر بزم ادب کے تحت یہاں کے شاعروں اور ادیبوں کو منظم کرنے کا بیڑا اٹھایا – ۱۹۴۷ میں قومی کلچرل کانگرس کے بہت عرصہ تک جنرل سکرٹیری رہے – کشمیری زبان کی رسم الخط کمیٹی کے بھی آپ ایک ممبر تھے – ۱۹۵۰ میں آل انڈیا لنگویجز اسکالرس کانفرنس اور ۱۹۵۱ میں آل انڈیا کانفرنس آن لٹرس میں کشمیری زبان کی نمائیندگی کی – اکتوبر ۱۹۵۲ سے کشمیر بزم ادب کو نئی لائنوں پر چلانے کی پھر سے مہم شروع کی – آپ محکمہ ملبری کلچر کے ڈائیرکٹر ہیں –

میرزا عارف

حضرت شیخ العالم شیخ نورالدین رح

آپ کا نام نندہ سنز تھا جو بعد میں میر سید محمد ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ نے نورالدین میں بدل دیا۔ والد کا نام اسلام قبول کرنے سے پہلے سلرت سنز اور اس کے بعد شیخ سالارالدین تھا۔ سنز کشتواڑی بولی میں پہلوان، بہادر یا شجیع کو کہتے ہیں۔ اور کشمیری زبان میں نیک بخت والے کو۔ آپ کی والدہ ماجدہ کا نام صدرہ تھا اور وہ آڈوں (کیموہ) کی تھیں۔ آپ باغ سلیمان میں جو کہ کیموہ کے گاؤں میں واقع تھا ۷۷۹ھ میں پیدا ہوئے۔ کیموہ شہر انچھ سے دو اڑھائی میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ شہر انچھ وہی تھا جس کو ہم آج اسلام آباد یا اننت ناگ کے نام سے پکارتے ہیں۔ البتہ ایک چھوٹا سا گاؤں اسلام آباد سے آدھ میل شمال کی جانب اب بھی انچھ ڈورو کے نام سے اس شہر کی یادگار کے طور پر باقی ہے اور ساتھ ہی وہ چھوٹی سی پہاڑی جس کے دامن میں اسلام آباد کا قصبہ ہے، انچھ ٹینہ کے نام سے موسوم ہے۔

آپ کے اجداد کشتواڑ کے سردار تھے۔ زمانہ کے انقلاب سے جب سرداری اُن کے ہاتھ سے نکل گئی تو وہ دو بھائی وہاں سے جان بچا کر نکل آنے میں کامیاب ہو گئے اور بھاگ کر کشمیر چلے آئے۔ ایک بھائی وڈدرکوٹ میں جا بسا اور دوسرا تیلہ سر میں آباد ہو گیا۔ ان ہی میں سے ایک بھائی حضرت شیخ نورالدین رحمۃ اللہ علیہ کے جدِ امجد تھے جن کا نام ڈگرآسنز تھا۔ یہ واقعہ ۷۲۴ھ کا ہے جب کہ ذولچو نامی ایک خونخوار جرنیل ترکستان سے آکر بارہ مولہ کے راستہ سے کشمیر پر حملہ آور ہوا۔ یہ شخص اپنی سفاکی اور قتلِ عام کرنے کے باعث ہلاکو خان کہلایا۔ اس کے ساتھ ستر (۷۰) ہزار مسلح فوج تھی۔ اس سفاک نے جس وقت کشمیر کو انسانی خون سے لالہ زار بنا دیا، راجہ سہہ دیو جو کہ اُس وقت یہاں کا حکمران تھا، مقابلہ کی تاب نہ لا سکا اور میدان چھوڑ کر بھاگ گیا۔ گرمیوں کے موسم میں تو ذولچو نے قتل و غارت اور بربریت کا بازار گرم رکھا، لیکن یہاں کی سردی برداشت نہ کر سکا۔ جب برف باری ہوئی اور شدت کی سردی پڑی تو اُس نے کشمیر چھوڑنے کا ارادہ کیا۔ کشمیر میں ہر طرف ہُو کا عالم تھا۔ جو کشمیری بچ گئے تھے وہ اس کے خوف سے جنگلوں میں چھپے پھرتے تھے۔ اُس نے اپنے کشمیری خادموں سے ہندوستان جانے کا راستہ پوچھا تو اُنہوں نے اس کو موت کے منہ میں ڈھکیلنے کے لئے توسہ میدان کا راستہ دکھایا جو بہت ہی دُشوار گذار تھا۔ جب اپنے ساتھیوں اور لاؤ لشکر کے ساتھ ذولچو توسہ میدان پہنچا تو اتنی شدید برف باری ہوئی کہ وہ سب کے سب اس کے نیچے دب کے ہلاک ہو گئے۔

بہار آنے پر بچے کھچے کشمیری اپنے گھروں کو واپس لوٹے۔ حکومت کا نظم و نسق تحس نحس ہو چکا تھا۔ لوگ آپس میں خانہ جنگیوں میں مبتلا ہو گئے تھے۔ پرگنہ تیلہ سر (اس نام کا ایک گاؤں اب بھی چرارِ شریف کے قریب واقع ہے) میں خمنی دانی راج کرتا تھا۔ اور ڈگرآسنز اس کا سپہ سالار تھا۔ شیخ العالم رحمۃ اللہ علیہ خود بھی اس کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

یتہِ خمن لون نپ وشادشں اوسہ — بُتھ تتہِ اکھ نپ خمنی دہ دہ نیو؟
خمنی دہ دہ نو تیلہ سر اوسہ — بوٹن دونی ولہِ گاشو حبد میو نو

خمنی دانیو کو ایک روز شکار کا شوق ہوا۔ ہر طرح کے عیش و طرب کا سامان تیار کیا۔ ڈگرآسنز کو اپنا نائب مقرر کر کے

دھجن کوٹ کی طرف تفریح کے لئے چلا گیا۔ جب غمنی وانیو کافی دیر دارالحکومت سے دور رہا تو اس کے دشمنوں کو سازش کا موقعہ ملا۔ کریوہ باروواہ کے سردار مکندراز نے جو پہلے ہی سے غمنی وانیو کا دشمن تھا، موقع غنیمت جان کر تیلہ سر پر پوری تیاری کر کے چڑھائی کی۔ گھمسان کا رن پڑا۔ ڈگراسنز میدان میں ہی ہلاک ہو گیا اور تیلہ سر پر مکندراز قابض ہو گیا۔ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ اس واقعہ کو یوں بیان کرتے ہیں ؎

جدھیون ڈگراسنز اوسو ڈگراسنز رن اندر مرو
اک ست ٹیوہ درتپا شیر درتپا شیر تمی ست سل تہ چھلو

غمنی وانیو نے جب یہ خبر سنی تو اُسے انتہائی دکھ ہوا۔ ادھر اُدھر سے امداد طلب کی اور راجہ مانزی نے اپنی فوج پیش کی۔ غمنی وانیو نے تیلہ سر پر حملہ کیا۔ کافی جنگ وجدل کے بعد میدان غمنی وانیو کے ہاتھ رہا۔ مکندراز قتل ہوا اور غمنی وانیو پھر اپنی گدی پر قابض ہوا۔

اس جنگ میں ڈگراسنز کا بیٹا درتپا شیر صلو پہلوانی میں ممتاز رہا، غمنی وانیو نے اُسے زرکاسنز کا خطاب دیا۔ کشمیری زبان میں زرکاسنز کے معنی شجیع اور دلیر کے ہیں۔

غمنی وانیو کی وفات کے بعد زرکاسنز کا بیٹا ہنبرسنز اس کے بیٹے کا دیوانِ خاص رہا۔ غمنی وانیو کا بیٹا اپنے باپ کے برعکس بہت ہی بدمست راجہ ثابت ہوا۔ لوگ مطمئن نہیں تھے۔ ہر طرف پریشانی پھیل گئی۔ ہنبرسنز کا ایک بیٹا جس کا نام سلتت سنز تھا، اس راج سے متنفر ہو کر تیلہ سر سے بھاگ گیا اور پرگنہ دیوہ سر (قصبہ کولگام) میں پہنچ کر حضرت سید حسین سمنانی رح کی خدمت میں حاضر ہوا اور مسلمان ہو گیا۔ حضرت نے اس کا نام شیخ سالار الدین رکھا۔ یہی وہ خوش قسمت باپ ہے جس کے یہاں حضرت شیخ العالم شیخ نور الدین رح نے ظہور فرمایا۔

شیخ سالار الدین کا نکاح صدرہ ماجی سے ہوا تھا۔ واقعہ یوں بیان کیا جاتا ہے کہ صدرہ ماجی دودر کوٹ موضع کھر علاقہ آڈون کے ایک شریف گھرانے کی لڑکی تھی۔ اس کے والدین نے اس کی نابالغی میں ہی اس کا نکاح ایک ایسے شخص سے کیا تھا جو پہلے ہی سے دو لڑکوں کا باپ تھا اور وہ اس کو خانہ داماد بنا کے اپنے گھر لائے تھے۔ صدرہ ماجی کے بالغ ہونے سے پہلے ہی یہ شخص وفات پا گیا۔ لڑکی کے والدین اس حادثے سے بہت ہی متفکر ہوئے چنانچہ اس کا باپ حضرت سید حسین سمنانی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنی درد بھری کہانی سنائی۔ آپ نے مراقبہ میں سر ڈالا اور تھوڑی دیر کے بعد سر اٹھا کے فرمانے لگے کہ صدرہ ایک اولوالعزم ولی کی ماں بنے گی۔ انہوں نے اس کو تجویز دی کہ وہ شیخ سالار الدین کو جو کہ حضور کی خدمت میں کئی سال سے رہتا تھا، خانہ داماد کی حیثیت میں اپنے گھر لے جائے۔ اس پر صدرہ ماجی شیخ سالار الدین سے بیاہی گئی۔ دونوں میاں بیوی متقی اور صالح تھے اور بڑی محبت سے زندگی بسر کرنے لگے۔

ایک رات شیخ سالار الدین نماز خفتن ادا کرنے کے لئے مسجد کی طرف جا رہے تھے۔ راستہ میں ایک برہمن کا مکان پڑتا تھا۔ اس نے برہمن کو اپنی بیوی سے کہتے ہوئے سنا کہ آج رات کے آخری پہر کو ایک سعادت مند ستارہ آسمان پر چمک اٹھے گا، اگر اس وقت کسی نیک بخت ماں کے بچہ لگ جائے تو وہ نیکی کے آسمان پر سعادت مندی کا تارا بن کے چمکے گا۔ گھر پہنچ کے شیخ سالار الدین نے اپنی بیوی سے برہمن کی یہ بات کہی اور دونوں نے اس سعادت مندی کو پانے کی ٹھان لی۔ مقررہ وقت پہ دونوں نے پاس کے چشمہ سے خوب نہا دھو کے برہمن کے کہے ہوئے کے مطابق عمل کیا۔ اور خدا سے نیک اولاد کی دعا مانگی۔ صدرہ ماجی کے نصیب میں حضرت شیخ العالم آ گئے۔

برہمن اور اس کی بیوی بھی بڑی بے صبری سے اس رات کے آخری پہر کا انتظار کرتے تھے۔ یہ بھی ایک بچہ کے

والدین بننے میں کامیاب ہو گئے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کا بیٹا دُبہ سادم بابا بام الدین تھا جو حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے چار بزرگ دوستوں میں سے ایک تھے۔ روایت ہے کہ حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ روضۂ مطہرہ پہ اوراد فتیحہ پیش کر رہے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جلوہ گر ہوئے۔ آپ نے آنحضرت ؐ کے سامنے ایک چھوٹا سا لڑکا دیکھا جس کے چہرے پہ بزرگی کے آثار نمایاں تھے۔ دریافت کرنے پہ معلوم ہوا کہ یہی لڑکا سرِحلقہ ریشیان کشمیر بننے والا ہے اور ابھی بطنِ مادر ہی میں ہے۔

حضرت امیر کبیر رح اس کے بعد کشمیر تشریف لائے اور اسلام آباد پہنچ گئے۔ صدرہ ماجی اور شیخ سالار الدین نذر و نیاز لے کے خدمت میں حاضر ہو گئے۔ حضرت موصوف رح نے صدرہ ماجی کی طرف زیادہ توجہ فرمائی۔ نام دریافت فرمایا اور اس کے معنی (صدرہ کے معنی ہیں سمندر) سُن کے فرمایا۔ اسی لئے اس صدف کو خدا نے اپنا قیمتی موتی منتخب کیا ہے۔ یہ ایک بہت بڑے ولی کی والدہ بننے والی ہے۔ للہ عارفہ سے جو ان کی صحبت سے مستفید ہو چکی تھی، فرمایا کہ "اس بچہ کی روحانی تربیت خاص طور پہ کی جانی چاہیئے۔"

حضرت شیخ رح ۷۷۹ھ میں پیدا ہو گئے۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت شیخ نے اپنی ماں سے دودھ نہیں پیا۔ للہ عارفہ آئیں۔ آپ کو گود میں اٹھایا اور کہا۔ "چہ مالِ چہ۔ زینہ مندہ چھک نہ چنہ چھکھاہ مندہ چھان۔" "پی لے بیٹا، پی لے۔ پیدا ہونے سے جب شرمایا نہیں تو دودھ پینے سے کیا شرماتا ہے۔"

حضرت شیخ رح بچپن سے ہی از خود رفتہ تھے۔ ربودگی اور مستی کا عالم زیادہ طاری رہتا تھا۔ سات سال کی عمر میں کوہ و دشت میں گھومنے لگے۔ اسی عالم میں ایک روز چار بزرگوں سے ملاقات ہوئی۔ ایک نے فرمایا کہ میں بہاؤ الدین ذکریا ہوں۔ تم میں روحانی بزرگی حاصل کرنے کی استعداد دیکھتا ہوں۔ نیکی میں شب و روز کوشاں رہنا۔ ہم سے جو کچھ ہو گا وہ ہم تیرے لئے کر دیں گے۔ دوسرے نے کہا کہ میں شیخ فرید الدین شکر گنج ہوں۔ "اے بیٹے میں نے اپنے خورد و نوش سے ہاتھ کھینچا تھا اور کسی کے دسترخوان سے نہیں کھایا۔ تیسرے بزرگ نے بتایا کہ میں لعل باز قلندر ہوں۔ اے فرزند میں نے کس و ناکس کی معیت کی کوشش نہیں کی۔ اپنی ساری عمر ایک ہی کرتہ پہنا۔" چوتھے صاحب نے کہا۔ "میں سید جلال الدین بخاری ہوں، میں دنیا بھر میں پھرا اور صاحب دلوں سے فیض حاصل کیا۔ حضرت شیخ العالم رح نے سینہ پر ہاتھ رکھ کر انہیں یقین اور وعدہ دیا کہ میں آپ چاروں بزرگوں کے کہنے کے مطابق عمل کروں گا۔ اس کے بعد یہ پاک ارواح نظر سے اوجھل ہو گئیں۔

اسی عمر میں شیخ العالم سے حضرت علی ثانی رح کی ملاقات ہوئی۔ حضرت امیر کبیر رحمۃ اللہ علیہ دوسری بار کشمیر تشریف لائے تھے اور اسلام آباد میں کیمپ کیا تھا۔ کیمہ بھی گئے۔ وہاں پہنچ کے حضرت شیخ سے جو ابھی سات سال کے بچے تھے، خلوت میں بہت دیر باتیں کیں۔ حضرت اعلام الدین رح جو آپ کے ساتھ تھے رنجیدہ خاطر ہوئے کہ اتنے بڑے بزرگ کا ایک چھوٹے لڑکے کے ساتھ اتنی لمبی چوڑی ملاقات کے کیا معنی ہیں۔ حضرت امیر کبیر رح نے بعد میں اعلام الدین سے کہا۔ "دیکھو ایسے خیالات کو دل میں جگہ نہ دیا کرو۔ تم نے اس بچے کو حقیر سمجھا ہے، یہ بچہ خورشید اوجِ ہدایت ہے، یاد رکھو وہ دن عنقریب آئے گا کہ تم اس کی مریدی کی تمنا کرو گے۔"

حضرت علی ثانی رحمۃ اللہ علیہ پکھلی کے راستہ ختلان واپس روانہ ہوئے۔ پکھلی پہنچ کر بیمار ہو گئے۔ اور وہیں واصل بحق ہوئے۔ انتقال سے پہلے اپنے فرزند کے نام وصیتی چٹھی تحریر فرمائی۔ اور اس میں ان کو ہدایت دی کہ حضرت شیخ رح کی ملاقات کے لئے کشمیر ضرور آ جانا چاہیئے اور یا تو انہیں تربیت کرنی چاہیئے یا پھر ان سے ہی تربیت لینی چاہیئے۔

تیراہ سال کی عمر میں صدرہ ماجی نے حضرت شیخ کا نکاح سوگام کی ایک لڑکی ذی دیدی سے کیا۔ اس زمانہ میں بھی صغر سنی میں شادی کرنا عام رسم تھی۔ آپ دو لڑکوں اور ایک لڑکی کے باپ بن گئے۔

ایک روایت کے مطابق آپ اُنیس (۱۹) سال کی عمر ہی سے تارکِ دُنیا ہو گئے تھے۔ لیکن پھر بھی بتیس (۳۲) سال کی عمر تک کبھی کبھی گھر آجاتے تھے۔

پنتیس (۳۵) سال کی عمر میں سنہ ۸۱۴ھ میں حضرت سید میر محمد ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ سے جو کہ حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند تھے اور کشمیر میں آئے تھے، آپ کی مُلاقات ہو گئی۔ اور آپ نے حضرت سید رح سے کبروی سلسلہ کے مطابق تربیت حاصل کی۔ (حضرت سید محمد ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ کا خطِ ارشاد جو اُنہوں نے حضرت شیخ العالم رحمۃ اللہ علیہ کو عطا کیا تھا، مضمون کے خاتمہ پہ دیا جاتا ہے)

آپ مجاہداتِ نفس میں دُنیا کے رشیوں میں برگزیدہ ہیں۔ حضرت سید محمد ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ کے حلقۂ ارادت میں آنے سے پہلے آپ اُویسی سلسلہ کے پیرو تھے، یعنی آپ روحانی فیض براہ راست منبعِ ہدایت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کرنے کے قائل تھے۔ وادیٔ کشمیر میں تبلیغ اسلام اور ساقیٔ مے خانۂ عرفان ہونے میں آپ حضرت امیر کبیر میر سید علی ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد کا درجہ رکھتے ہیں۔ آپ کے دور میں اہلِ ہنود میں بھی بہت سے اعلیٰ پایہ کے بزرگ تھے جن میں سے اکثر نے آپ کے فیض و برکات سے اسلام قبول کیا۔

آپ کے چار دوست تھے جو کہ بہت بلند پایہ صوفی ہوئے ہیں جن کے اسمائے گرامی یہ ہیں:۔ بابا زین الدین، بابا بام الدین بابا نصر الدین اور بابا لطیف الدین۔ ان کے علاوہ بے شمار لوگ آپ کی نظرِ کرم سے ولی ہو گئے۔

آپ سنہ ۸۴۲ھ میں ۶۳ سال کی عمر میں واصلِ حق ہو گئے۔ بابا نصر الدین نے تاریخ وفات کہی ہے:۔

دوپ نصرؔ مہ تاریخ ورگ
فرند زود تھ گیہ بایہ مرگ
۸۴۲

حضرت امیر کبیر رحمۃ اللہ علیہ کی یادگار میں سرینگر کے شہر میں جو مشہور و معروف خانقاہ معلّیٰ ہے اس میں ایک ایسا حجرہ بھی ہے جس کو گنجینۂ ادب و آثارِ قدیمہ کہنا زیادہ موزون ہے۔ اس کی چھان بین کی طرف آج تک کبھی توجہ نہیں دی گئی تھی۔ کوئی مہینہ بھر ہوا کہ اس گنجینہ میں غلام احمد صاحب زہرہ ہمدانی کی کوششوں سے بار پائی گئی اور دوسری چیزوں کے علاوہ وہ اصلی خطِ ارشاد بھی پایا گیا جو کہ حضرت سید محمد ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت شیخ العالم شیخ نور الدین نورانی رح کو عطا کیا تھا۔ یہ خط کاغذ نما چمڑے یا چمڑہ نما کاغذ (ابھی تصدیق نہیں ہو سکی) پہ سیاہ روشنائی سے تحریر ہے۔ خط کا اردو ترجمہ اور عربی عبارت پہ اعراب کی ایزادگی ہماری طرف سے ہے۔

اب آپ یہ تاریخی خطِ ارشاد مُلاحظہ فرمائیے

۸۴۲
۷۷۹
۶۳

۸۴۲
۸۱۴
۲۸

وَاعْلَمْ اَنَّ الْبَیْعَۃَ مِنْ سُنَنِ الْاَنْبِیَاءِ عَلَیْهِمُ السَّلَامُ وَ

تو جان لے کہ بیشک بیعت انبیاء علیہم السلام و

مِنَ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِیْنَ الْمَهْدِیِّیْنَ وَهِیَ بَاقٍ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ

خلفاء الراشدین المہدیین کی سنت سے ہے اور یہ سنت قیامت کے دن تک بلا تغیر باقی رہیگی

بِلَا تَغَیُّرٍ فَلَا یَجُوْزُ لِاَحَدٍ مِنَ الْاَوْلِیَاءِ وَالْعُلَمَاءِ اِدِّعَاءُ الْخِلَافَةِ

پس اولیا اور علماء میں سے کسی کے لئے جائز نہیں کہ وہ اپنے اختیار سے بلا اجازت و بیعت

بِلَا الرُّخْصَةِ وَالْبَیْعَةِ بِاِخْتِیَارِهٖ اِلَّا اَنْ یَکُوْنَ لَهُ الرُّخْصَةُ مِنَ الشَّیْخِ الَّذِیْ یَکُوْنُ

خلافت (الٰہیہ) کا دعوٰے کرے جب تک کہ اسکو ایسے ایک پیر کامل سے اجازت نہو جو کہ حقیقی معنوں میں

مَاذُوْنًا وَمُرَخَّصًا بِالتَّحْقِیْقِ مِنَ الشَّیْخِ الْعَامِلِ الْکَامِلِ اِلٰی نَبِیِّنَا صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ

ایک ایسے مرشد سے اذن پا چکا ہو اور اجازت یافتہ ہو جس کا سلسلہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم تک مسلسل رہا ہو

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان اور بخشنے والا ہے

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ وَفَّقَنَا وَسَائِرَ الْعِبَادِ بِاتِّبَاعِ طَرِیْقِ الْهُدٰی

سارے ثناء و شکر اس ذات باری کیلئے جس نے کہ ہمیں اور سارے (نیک) بندوں کو راہ ہدایت کی پیروی کی توفیق عطا فرمائی

وَحَفِظَنَا وَجَمِیْعَ الْاَخْیَارِ الْاَبْرَارِ مِنْ اِقْتِدَاءِ اَهْلِ

اور ہم کو نیز تمام نیک اور برگزیدہ بندوں کو اہل بدعت اور اہل ہوا کی اقتداء سے بچایا

الْبِدَعِ وَالْهَوٰی وَبَلَّغَنَا وَطَوَائِفَ الْمُخْلِصِیْنَ

اور ہمیں نیز مخلصوں اور محبوں کے گروہوں کو

الْمُحِبِّیْنَ اِلٰی اَقْصَی الْمَرَاتِبِ هِیَ الْمَعْرِفَةُ الْکُبْرٰی وَالصَّلٰوةُ

(ان) بلند ترین مرتبوں پر پہونچا دیا جن مراتب کا نچوڑ معرفت کبرٰی ہے۔ اور درود و

وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِهٖ وَنَبِیِّهٖ وَصَفِیِّهٖ مُحَمَّدِنِ الْمُصْطَفٰی وَ

سلام ہو اس کے رسول۔ اور اسکے نبی اور اس کے صفی حضرت محمد مصطفٰے پر (صلعم)۔ اور

عَلٰی اٰلِہِ الَّذِیْنَ مَحَبَّتُھُمْ وَسِیْلَۃٌ لِلسَّعَادَۃِ الْعُظْمٰی وَ

ان کی اولاد پر جن کی مودت بڑی نیک بختی اور

الدَّوْلَۃِ الْاَعْلٰی وَاَصْحَابِہِ الَّذِیْنَ کَالنُّجُوْمِ بِاَیِّھِمِ اقْتَدَیْنَا

اعلیٰ (روحانی) حکومت (حاصل کرنیکا) ذریعہ ہے - اور اُن کے اُن ساتھیوں پر جو کہ (فلک روحانیت کے) کوکب تاباں ہے

اِھْتَدَیْنَا فَیَقُوْلُ الْعَبْدُ الضَّعِیْفُ النَّحِیْفُ الْجَانِیْ کَثِیْرُ

اور جن کی اقتدا سے ہم ہدایت پا چکے - امابعد پس (راقم الحروف) محمد بن علی بن شہاب الدین الہمدانی جو ضعیف

التَّقْصِیْرِ وَالتَّوَانِیْ مُحَمَّدُ بْنُ عَلِیِّ بْنِ شِھَابِ الدِّیْنِ الْھَمَدَانِیْ

نحیف خطا کار اور سراپا تقصیر ہے

عَفَی اللّٰہُ عَنْہُ بِالْفَیْضِ الصَّمَدَانِیْ:- اِعْلَمْ اَنَّ الْمَقْصُوْدَ مِنْ خَلْقِہِ

(خدا اسکو اپنی خاص عنایتوں سے نوازے) کہتا ہے کہ:- جان لے کہ انسان کی پیدائش کا مدعا و مقصد

الْاِنْسَانِ مَعْرِفَۃُ اللّٰہِ تَعَالٰی سُبْحَانَہٗ کَمَا یَشْھَدُ بَعْضُ

خدائے پاک کی معرفت ہے - جیسا کہ بعض آیات کریمہ

الْاٰیَاتِ الْکَرِیْمَۃِ وَالْاَحَادِیْثِ الْقُدْسِیَّۃِ وَالْاَخْبَارِ

احادیث قدسیہ اقوال نبویہ

الشَّرِیْفَۃِ وَالْاٰثَارِ اللَّطِیْفَۃِ فَالْوَاجِبُ عَلٰی کُلِّ فَرْدٍ مِنْ اَفْرَادِ

اور پاکیزہ تواریخ شاہد ہیں پس بنی نوع انسان میں سے ہر ایک کے لئے لازم ہے

الْاِنْسَانِ اَنْ یَسْعٰی لِمَا خُلِقَ لَہٗ وَالطُّرُقُ اِلَی اللّٰہِ تَعَالٰی

کہ وہ اس مقصد کے لئے جس کیلئے وہ پیدا کیا گیا ہے جد و جہد کرے - اور چونکہ خدا کی طرف جانے والی راہیں

مِمَّا لَا تُعَدُّ وَلَا تُحْصٰی لِقَوْلِہٖ عَلَیْہِ اَفْضَلُ الصَّلٰوۃِ

لاتعداد اور بے شمار ہیں جیسا کہ آنحضور علیہ افضل الصلوات

وَاَکْمَلُ التَّحِیَّاتِ "اَلطُّرُقُ اِلَی اللّٰہِ تَعَالٰی بِعَدَدِ اَنْفَاسِ

واکمل التحیات نے فرمایا ہے "اللہ کی طرف رہنمائی کرنے والی راہیں مخلوقات کے سانسوں کی تعداد کے

الخلائق" ومن أقربها طريق العلية العالية الشريفة الكبروية الهمدانية

برابر ہیں" اور ان میں سے قریب ترین طریقہ علیہ عالیہ شریفہ کبرویہ ہمدانیہ

الحسينية المذهبية الذی دلّ علیّ والدی علی الهمدانی قدس الله

حسینیہ مذہبیہ ہے جس کی رہبری مجھے میرے والد علی الہمدانی قدس اللہ

سرّه السبحانی كما دلّ وهدى عليه المشائخ الذين اجازوه بالارشاد

سرہ السبحانی نے کی جیسا کہ اس راہ پر اُن مشائخ نے اُن کی رہنمائی کی جنہوں نے انکو ارشاد کی اجازت بخشی

وهم ثلثة وثلثون كلهم من أكابرهم :- وبعد فانّ الاخ الصالح

اور جن کے اکابر کی کل تعداد ۳۳ ہے بعد آں یہ کہ میرے بھائی المسمّٰی

العارف الكاشف المجاهد المشاهد المسمّٰی بنور الدين ريشي

نور الدین ریشی الکشمیری نے جو کہ صالح - عارف - صاحب کشف و مجاہدہ و مشاہدہ ہیں

الكشميري الزاهد العابد أصلحه الله كما أصلح الصالحين

اور جو زاہد بھی ہیں اور عابد بھی (خدا ان کو صالحین اور عارفین کی طرح اصلاح کرے

العارفين وأحسنه الله كما أحسن الواصلين الكاملين

اور واصلین اور کاملین کی طرح اُن کو ممنون احسان رکھے)

فلما جاوز عن حدّ الالحاح وعجز كثيرا بلسانه أن

اصرار کی حدود سے آگے بڑھ کر زبان حال سے عاجزی کی کہ وہ

يدخل في السلسلة العاشقين الكاملين المكمّلين كما أدخل

سلسلۂ عشاق الکاملین المکملین میں داخل ہو جائیں جیسا کہ تمام (علم معرفت کے

أسوة جماهير المبتدئين والمنتهين فأجزته بتوبة المريدين وبيعتهم

مبتدی اور اس علم کے انتہا پر پہونچنے والے داخل ہو چکے ہیں - پس میں نے انکو اجازت دی کہ وہ ارادتمندوں کو توبہ کرائیں

وترغيب الطالبين السالكين وتربيتهم وتعليم الاذكار كاربع

ان سے بیعت لیں - اور راہ ہدایت کے طالبوں اور اس راہ پر چلنے والوں کو ترغیب دیں اور تربیت بہم پہونچائیں اور ان اذکار مثلاً ذکر

الضُّرُوبِ لِتَصْفِيلِ الْقَلْبِ عَنْ كُدُوْرَاتِ الْمَكَائِدِ وَ

(چار ضرب) کی تعلیم کریں جو کہ اُن کے دلوں کو مکّاریوں اور (دیگر)

الْكُرُوْبِ وَأَخْذِ النُّذُوْرَاتِ وَالْفُتُوْحَاتِ وَجُلُوْسِ

دُشواریوں کے گدے پن سے صاف کریں (مزید) اُن کو نذر و ہدایا قبول کرنے اور چلہ کشی کے لئے

لِخَلَوَاتِ الدَّائِمِ كَالْأَرْبَعِينَاتِ الْقَائِمِ وَسَائِرِ مَا يَجِبُ وَ

ہمیشہ خلوت نشین رہنے اور اُن تمام طریقوں کے اختیار کرنے کی

يَسْتَحِبُّ فِي هٰذَا الطَّرِيْقِ الْعَالِيَةِ السَّادَاتِ وَسَبِيْلُهُ اَنْ

اجازت دی جو اس طریقۂ عالیہ سادائیہ میں واجب و پسندیدہ ہیں اور اس (مسلک) کی سبیل یہ ہے

لَا يَنْسَانِي فِي الْأَوْقَاتِ الشَّرِيْفَةِ الْمَرْجُوَّةِ بِالدَّعَوَاتِ بَعْدَ

کہ وہ مجھے اُن نیک اوقات پر بھول نہ جائیں جن کے اقوال و اشغال کے نتیجہ میں

الْاَقْوَالِ وَالْاَشْغَالِ ٭ قَدْ حَرَّرْتُ هٰذَا فِي لَيْلَةِ

دعائیں شرف قبولیت پاتی ہیں میں نے لکھا اسکو شب

الْجُمُعَةِ خَامِسَ عَشَرَ مِنْ شَهْرِ رَجَبِ الْمُرَجَّبِ سَنَةَ اَرْبَعَ عَشَرَ

جمعہ مورخہ ١٥ ماہ رجب المرجب سنہ ٨١٤ھ

وَثَمَانَمِائَةَ فِي بَلَدِ الْكَشْمِيْرِ صَانَهَا اللهُ تَعَالىٰ مَعَ سُكَّانِهَا عَنِ

دار الخلافہ کشمیر میں خدا اسکو اور اس کے باشندوں کو

الْاٰفَاتِ وَالتَّدْمِيْرِ ٭

آفات اور تباہی سے بچائے

مہر محمّد ہمدانی

تحقیقی مضامین:- تحقیقی نوعیت کے تمام مضامین کے حقوق بحق کشمیر بزم ادب محفوظ ہیں۔ صدرِ بزم کی تحریری اجازت کے بغیر ان سے کسی قسم کا اخذ، و اقتباس قانونی طور پر ناجائز تصوّر ہوگا۔

مترجم:۔ کامل

کلامِ شیخ العالمؒ

(۱)

کیاہ کرہ پانژن دہن تہ کہن
ییم ییتھ لیجہِ وکشن کرِتھ گے
سارِی سمہن اکس رزِ لمہن
اَدہ کیازِ راوِہ ہی کہن گاو

(۱)

کیا کروں سے کہ تیں ایسے پانچ دس گیارہ کی دست!
اپنی اپنی جو کہ ڈفلی کو بجاتے آئے۔ ہائے!
تھام لیتے ایک ہی رسی اگر مِل جُل کے سب
ہاتھ سے گیارہ ہوائیں کے نہ گم ہو فی بنتی گائے!

(۲) عِلم ملاؤں کا ہے منصب و حشمت کے لئے
تاک میں اِک دوسرے کے ہیں لگے یہ تیرہ ذات
جانے کیونکر ہے انہیں اپنی فضیلت کا گمان
حشر کے دِن ایک بھی پائے نہ لاکھوں میں نجات

(۲) عِلماہ پُروو وفرکے ہوسے
ژھلس چھوہ زاگن اکس اکھ
کوہ چھوہ گمانہ اُس چھی خاصے
تہ نو کلیوہ ساسہ منزہ اکھ

(۳) برونٹھ کنہِ تھاوِتھ کتابہ لَرہ
وَچہ وچہ موہ یہِ تہ موہیہِ ٹانچران
وُچھتوکھ اندرِ تہ چھی ژھرہ
پَرسی پَرن تہ مَشرن پان

(۳) سامنے اپنے کتابوں کا لگا کر ایک ڈھیر
موشگافی کیا ہی کرتے ہیں، زبانیں کھول کر
اور اگر باطن کی پوچھو، ڈھول ہیں یہ کھوکھلے
دوسروں کو وعظ و تلقین اور خود ہیں بے ثمر

(۴) آتشِ عشق میں جل جائے جو، عاشق ہے وہی
وُہ جو سونے کی طرح چمکے، سراپا تاب دے
جس کے دِل کی ہر رگ و پَے میں سموئے زہرِ عشق
ایسے انسان کا مکاں، قیدِ مکاں سے ہے پرے

(۴) عاشق سُوی یُس عشقہ نارہ دزِی
سُن زن پرزلِ پننوی پان
عشقن ذَریَس والنچہ سَنزی
سُوی ہیہ نالہِ واتی — لامکان

(۵)

گندہ پانس مو دِو رَندے
اَمہِ شرل وُتھی پیے تہ کیاہ؟
اَمہِ تسبیحہ عاصہ تہ جندے
اَمہِ فندہ نو اَتھہِ پی سوُ زاہ

(۶) کچھ وہ ہیں کہ کیا جن کو اُدھر ہی سے پکار
کچھ وہ ہیں جنھوں نے جبہ ہی کو پی کر رکھ دیا
کچھ تو وہ ہیں جن کی آنکھیں پی کے مے پتھرا گئیں
کچھ وہ ہیں کہ کیست پک کر ٹڈیاں بیٹھیں اُڑا

(۷) کینژن دِتھہ یتہِ کیہہ تتی
کینژن یتہِ نتہِ تتی کیاہ
کینژن راز لیوتھ گاہ ہِیوہ وتی
کینژن مندِ نِینہ گٹہ ہی گاہ

(۸) تُو اگر توحید کی سُن لے ! تو کیا زندہ رہے ؟
کیا کہوں کتنا ہے اس وحدت کا سوز و التہاب
اس تک عقل و تفکر راہ پا سکتے نہیں
پی سکا ہے کیا کوئی پیاسے بھلا یہ بحرِ آب

(۵)

اپنے میلے تن کو اے پیارے تو دِندے سے نہ چھیل
ایسی نادانی سے کیا یہ میل ہو سکتا ہے دُور ؟
دلق و تسبیح و عصا کو چھوڑ بھی دے اے میاں !
ایسی مکاری سے ہاتھ آتا نہیں وہ "جانِ طور"

(۶) کینژن دِتھہ اورَ سے آلوَ
کینژن راَس گیہ نالے وٕتھ
کینژن مَس چیتھ اَپھِ لچہ تالوَ
کینژن پیتھہ گے ہالوَ کھیتھ

(۷) ایک وہ ہیں کہ جنھیں یاں بھی دیا ، واں بھی دیا
ایک وہ ہیں کہ جنھیں یاں نہ ملا ، واں کیا ملے
ایک وہ ہیں کہ اندھیرے میں ہوئے غرقِ جمال
ایک وہ ہیں کہ اُجالے میں ہیں ڈھونڈتے ہوئے

(۸) گُنزے بوزِتھ گُنہ نو روز کھ
اَمہِ گُنزن کوتاہ دِیت جلاوٕ
کاٹہ تہِ فکر تو رکُت سوزکھ
کیشہ مالہِ چیتھ ہوکہ یہ دریاوٕ

(تحت اللفظ ترجمہ)

پروفیسر حاجنی

(پہلی قسط)

کشمیر کا فردوسی ــــ وہاب پرے

وادیٔ کشمیر کے دور افتادہ دیہات میں ابھی یہ حسرتناک خبر سنائی نہیں گئی تھی کہ سکھوں کی ستائیس سالہ سکھاشاہی کا خاتمہ ۱۵ ربیع الاول ۱۲۶۲ھ کو بیعہ نامہ امرتسر کے سوء البدل سے ہو چکا ہے۔ ابھی ایک کشمیری کی زندگی کا معاوضہ بیس نانک شاہی روپیہ سے گھٹ کر اڑھائی روپیہ ضرب شاہی تک نہیں پہنچا تھا۔ ابھی پوری وادی پر استبداد لوٹ اور عصمت دری کے کارندے کالی گھٹاؤں کی صورت میں چھائے ہی ہوئے تھے۔ ہر جگہ افلاس، بے چارگی، مظلومیت اور احساس کمتری کے بھیانک مناظر ابھی تاریخ کشمیر میں بدنما تزئین شواہد کا اضافہ کر رہے تھے کہ اسی پُر آشوب اور درد انگیز سال میں عبدالوہاب پرے جو کہ اپنے شعری کارناموں میں صرف وہاب تخلص کیا کرتے تھے، ۱۴ ماہ شعبان ۱۲۶۲ھ کو سوموار کے دن تحصیل سوپور کے ایک گاؤں حاجن میں کتم عدم سے منصب شہود پر جلوہ گر ہوئے۔ وہاب کی عمر ابھی ڈھائی سال سے آگے نہیں بڑھی تھی کہ ان کے والد بزرگوار نے جن کا نام مقصود تھا، داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ نیک دل والدہ نے اپنے اس جگر گوشہ کی تعلیم و تادیب میں اپنی طرف سے غیر معمولی انہماک سے کام لیا اور حاجن میں ہی (جو افغانوں کے عہد سے تدریس و تعلیم میں مواضع پائین المعروف شنی وارہ کا مرکز رہا ہے) قاضی حفظ اللہ کے سامنے زانوئے ادب تہ کرنے کے لئے بھیجا جہاں بیس سال کی عمر میں اُس زمانے کی مروجہ فارسی نصاب میں وہ فارغ التحصیل ہوا۔ بائیس سال کی عمر یعنی ۱۹۲۵ بکرمی سے لے کر زندگی کے ۹۳ سال تک وہاب کی زندگی مختلف پیشوں میں تگ و دو کرتی رہی۔ جن میں ٹھیکہ داری، ملازمت، دیہات پرداری (یہ عہدہ یعنی مالیہ کی وصولی کے سلسلے میں آجکل کے سول سپلائیز افسر کا ایسا تھا)

کار داری، تحویلداری (غلہ بٹائی کے عہد میں یہ عہدہ بہت ہی اہم تھا اور زمینداری خاص ذرائع روزگار بنے رہے۔ ملازمت کے سلسلے میں وہاب تقریباً بیس سال تک (۱۲۸۸ھ سے ۱۳۰۶ھ تک) ایک پٹواری کی حیثیت میں حلقہ حاجن میں، کچھ عرصہ بحیثیت ذیلدار علاقہ شالہ پھری میں اور ڈیڑھ سال تک (۱۹۳۴، ۳۵ بکرمی) بحیثیت نائب تحصیلدار پرگنہ بیروہ و مانچھہامہ میں اس زمانے کی سرکاری دفتری روایات کے مطابق "خوش اسلوبی" سے کام کرتا رہا۔ ان گوناگوں سیاسی اُلجھنوں اور مصروفیات کے ہوتے ہوئے بھی وہاب کی طبیعت میں بچپن ہی سے شاعرانہ صلاحیت انتہائی درجہ کی موجود تھی۔ چنانچہ اس کی حیات کا ایک ہی وہ شعبہ ہے جس میں کہ وہ ایک جاودانی اور نہ مٹنے والی زندگی حاصل کرنے میں کامیاب ہوا۔

اپنی تصنیفات کی خود نوشت فہرست میں وہ لکھتے ہیں کہ "سب سے پہلے میں نے ہفت قصہ مکرزن منظوم کشمیری میں تالیف کی۔ اس کے بعد ہفت قصہ اعمی اور پھر حمید اللہ اسلام آبادی کے اکبرنامہ کو فارسی سے کشمیری نظم میں منتقل کر لیا۔ انہی ایام میں نونہال گل بدن جو اُردو زبان میں ایک عشقیہ افسانہ ہے، کشمیری شعر میں ترجمہ کیا ساتھ ساتھ غزل گوئی بھی کرتا رہا۔ اور پھر قصہ چہار درویش اور بہرام گور کا بھی منظوم کشمیری میں ترجمہ کر دیا۔" کس قدر افسوس ہے کہ ان ادبی جواہر پاروں میں سے مکرزن ہفت قصہ اعمی اور نونہال گل بدن وہاب کی وفات کے بعد ناقدر شناس وارثوں کی لاپروائی کے صدقے ایسے تلف ہوئے کہ آجتک یقین کے ساتھ یہ فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ ان ناموں کی چھپی ہوئی دوسرے مصنفین کی کتابوں میں "ادب چوری کو" کہاں تک "دخل" حاصل ہے۔ مترجم کے اپنے ہاتھ سے لکھے ہوئے بہرام گور کے چند اوراق میں نے حاصل کر دئے ہیں۔ البتہ اکبرنامہ زمانے کی دست برد سے بالکل بچ نکلا ہے۔ اس میں ایک، صرف افغانوں اور دور سرکار

طرف انگریزوں اور سکھوں کی معرکہ آرائی کی تصویر کھینچ کر رکھدی گئی ہے دو ہزار دو سو چالیس رزمیہ اشعار کا یہ مجموعہ کشمیری زبان کا ایک قابل فخر شعری سرمایہ ہے جس میں مصنف نے افغانوں کی عسکری فوقیت بیان کرتے ہوئے سکھوں اور انگریزوں کی اس بے سود کوشش پر کڑی نکتہ چینی کی ہے جو وہ تسخیر افغانستان کے سلسلہ میں انتھک طور پر کر رہے تھے مغربی اور مشرقی تصادم کی یہ پہلی تصویر وہاب کی مرہون منت ہے لیکن جس ادبی کارنامہ نے وہاب کی شہرت کو چار چاند لگا دیئے ہیں وہ شاہنامہ فردوسی کا منظوم ترجمہ ہے۔ چار ضخیم جلدوں میں ایران کی اس افسانوی تاریخ کا وہاب نے تریسٹھ ہزار چار سو اکانوے اشعار میں شستہ، بامحاورہ، سلیس اور دل نشین ترجمہ کر کے ایران صغیر (کشمیر) کی زبان کو ممنون رکھا۔ اس کی پہلی جلد میں ۱۲۰۰۳ اشعار ہیں دوسری جلد میں ۵۱۰۱ اشعار، تیسری جلد میں ۸۰۰۰ اشعار، اور چوتھی جلد میں ۶۶۶۶ اشعار ہیں۔ وہاب اپنی غیر مطبوعہ فارسی میں فخر کے ساتھ اس ترجمہ کے متعلق لکھتا ہے ۔ اس کام کو سرانجام دینے کی مجھ سے پہلے کشمیر کے کسی فارسی زبان جاننے والے کو جرأت ہی نہیں ہوئی تھی "ہم چاہے اسے خود ستائش کہیں لیکن یہ ایک تاریخی حقیقت ہے جو جھٹلائی نہیں جا سکتی۔ پہلی تین جلدیں اُن کے نو سال (۱۲۹۷ھ سے ۱۳۰۶ھ تک) کی عرق ریزی کا نتیجہ ہیں چوتھی جلد کے ترجمہ و تالیف کے لئے اس کو تقریباً گیارہ سال صرف کرنے پڑے جس کی وجہ یہ ہے کہ آج سے ۶۵ سال پہلے وہاب نے فردوسی کی وطن پرستی اور شہنشاہ پرستی کے عواقب کو اُس کے شاہنامہ میں بھانپ کر ایک ایسی راہ اختیار کرنے کا ارادہ کیا جس کی طرف متوجہ ہونے میں فردوسی کو ایران نوازی ایک سد راہ بنی تھی۔ چنانچہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ فردوسی نے صحابہ کرام رضی کی فتوحات کو اپنی جبلی بسیارگوئی کے باوجود نہایت ہی اختصار کے ساتھ نظم کیا۔ بلکہ اشاروں ہی اشاروں میں ایرانیوں کی شکست پر اپنی ادبی شکست بھی تسلیم کی۔ وہاب نے نظریۂ قومیت کے اس ایرانی ہیرو کو اسلامی فتوحات کے بیان کے سلسلے میں لستہ لب پا کر سنہ ۱۳۰۶ھ میں لکھا ہے

کہم قصۂ نقل شاہنامہ رد ۔ بلس گوم مہ غیرت دینِ خود

اس کے بعد وہاب نے اسی تاریخ سے تسخیر ایران کے تمام تاریخی واقعات کی چھان بین شروع کی۔ اور نتیجہ میں ہمارے سامنے ۱۳۱۷ھ میں شاہنامہ کی چوتھی جلد ظاہر ہوئی۔ اس جلد کے ۶۶۶۶ اشعار میں سے ۴۱۰۲ اشعار ان فتوحات سے متعلق ہیں جن میں وہاب نے اس سیل رواں کی شرقی رو کا دل رُبا نقشہ کھینچا ہے جس کو تھامتے تھامتے فردوسی کا محبوب یعنی آخری ساسانی شہنشاہ یزد جرد تنکے کی طرح بہ گیا۔ گویا چوتھی جلد کا بیشتر حصہ وہاب کی ذاتی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ اور اگر اس جلد کا نام فردوسی کے تتبع میں "شاہنامہ اسلام" رکھا جائے۔ تو زیادہ موزوں رہے گا۔ کیونکہ یہاں پر وہاب، فردوسی کے ان چند اشعار کا نہ ترجمہ کرتا ہے اور نہ تشریح جو اس نے غازیانِ اسلام سے متعلق نظم کئے ہیں بلکہ اُن تاریخی تاثرات کو نظم کرتا ہے جو ایران کی شکست اور اسلام کی فتح پر منتج ہوئے ہیں۔

اس طویل ترین ترجمی کارنامہ سے فراغت پاتے ہی وہاب کو کشمیر کے مشہور و معروف ولی شیخ حمزہ رحمۃ اللہ کے پانچ خلیفوں کی پانچ تصانیف (ھدایۃ المخلصین مصنفہ میر بابا حیدر۔ تذکرۃ المرشدین مصنفہ خواجہ میر مراد۔ ھدایۃ الطالبین مصنفہ خواجہ حسن قاری۔ چلچلۃ العارفین مصنفہ خواجہ اسحاق قاری اور سلطانی مصنفہ شیخ احمد چاگلی) اپنے گاؤں ہا جن ہی میں کہیں سے دستیاب ہوئیں۔ یہ تمام تصنیفات حضرت شیخ حمزہ مخدوم رح کی سوانح سے متعلق ہیں۔ سلطانی کے بغیر باقی چار تصانیف کا بیشتر حصہ فارسی نثر میں ہے۔ وہاب نے ۱۳۱۷ھ سے ۱۳۲۲ھ تک ان پانچوں کتابوں کا تین ضخیم جلدوں میں منظوم کشمیری میں ترجمہ کیا اور پھر پوری کتاب کا نام "سلطانی" رکھا۔ اس کے اشعار کی تعداد ۱۷۰۵۳ ہے جس میں تیسری جلد کے آخر میں حضرت بابا داؤد خاکی خلیفۂ سلطان العارفین رحمۃ اللہ علیہ کی

مشہور نظم "وردالمریدین" کا (جوکہ ۳۴۳ فارسی اشعار پر مشتمل ہے) لفظ بلفظ کشمیری ترجمہ بھی شامل کیا ہے۔

انہی ایام میں وہاب نے شمائل آنحضرت صلعم کے نام سے ایک طویل نظم ایک ہی ردیف وقافیہ میں لکھی جس میں فقیہانہ انداز میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حلیہ نگاری کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ یہ ۳۳۶ ابیات کی نظم بھی وہاب کی باقی تالیفات وتصنیفات کی طرح ابھی تک غیر مطبوعہ ہے اور اس کی تاریخ تصنیف ۱۱ محرم الحرام سنہ ۱۳۲۰ھ ہے۔

سلطانی کا آزاد ترجمہ ابھی جاری ہی تھا کہ سنہ ۱۳۲۱ھ میں وادیٔ کشمیر کو ایک بلا خیز سیلاب نے تباہ وبرباد کرکے رکھ دیا۔ وہاب کا سریع الحس ذہن اس غیر معمولی حادثہ سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ اور اسی سال "سیلاب نامہ" نام سے ایک طویل نظم تخلیق کی۔ جس میں دیہات کی تباہ حالی اور عوام کی لاتعداد مصائب کو دل ہلا دینے والے اشعار میں بیان کیا ہے۔ حزنیہ کے بوجھ کو ہلکا کرنے کے لئے اس نظم میں مزاحیہ اشعار بھی کہے ہیں۔ جن میں ظرافت اور طنز دونوں کی لطیف چاشنی ملتی ہے۔

طنزیات میں وہاب کی ایک اور تصنیف بھی حوادث زمانہ سے بچ گئی ہے۔ جو دراصل وہاب کی سیاحانہ مشاہدات کی یادگار ہے۔ اس کا نام "درویشی" ہے۔ اس کو پڑھکر معلوم ہوتا ہے کہ وہاب علماء وفقراء کی پرکھ کے لئے وادیٔ کشمیر کے گمنام گوشہ تک خود پہنچ گیا ہے اور اپنے مشاہدہ کی بنا پر جہاں چند ایک خدا شناس بزرگوں کی روحانیت کو سراہا بھی ہے۔ وہاں بہت سے گندم نما جو فروش مذہبی رہنماؤں کو بھی سبق آموز ہجو کا ہدف بنا دیا ہے۔

ہجو گوئی میں وہاب کی ایک اور تخلیق "بے بوج نامہ" کا کہیں پتہ نہیں ملتا۔ البتہ اس کے چند اشعار حاجن میں آج تک عوام کی زبان زد ہیں جس سے یہ بات مترشح ہو جاتی ہے کہ اس دور رس شاعر نے اپنے وقت کے رؤسا اور حکام کو بھی راہِ راست پر لانے کی مخلصانہ کوشش کی تھی۔

"خلافت نامہ" وہاب کی ایک اور تاریخی تصنیف ہے جس میں خلیفہ اول کی خلافت سے لے کر وہاب کے ہمعصر عثمانی سلطان عبدالحمید خان تک نہایت اختصار کے ساتھ اسلامی حکمرانوں کی تخت نشینی کے سنین اور چند ایک اہم واقعات کشمیری میں نظم کئے گئے ہیں۔

ان تمام علمی وادبی منظوم شاہکاروں سے قطع نظر وہاب نہ صرف ہماری زبان میں ایک کامیاب مترجم اور رزمیہ مورخ ہی ہے بلکہ ایک بلند پایہ شاعر بھی ہے چنانچہ اس کلام کا مجموعہ "دیوان وہاب" اس کی زندگی میں ہی مدون ہوا ہے اس کے ۶۱۸۳ اشعار اور ۱۰۷ نظموں پر مشتمل ہیں۔ جن میں مناجات نعت، منقبت، رباعیات، غزلیات غرضیکہ قریب قریب تمام اصناف شعر شامل ہیں۔ یہ دیوان ۲۶ جمادی الاول سنہ ۱۳۲۵ھ کو مدون ہوا ہے۔ اس تاریخ سے لے کر زندگی کے آخری دن (۱۱ صفر ۱۳۳۳ھ) تک وہاب نے تصنیف وتالیف کا کام بالکل ترک کر دیا۔ دنیا سے متنفر ہو کر ایک طرح کی ہوشمندانہ گوشہ نشینی اختیار کی۔ اور جاہ وحشم کی زندگی سے دل برداشتہ ہو کر ذکر وفکر میں اس قدر منہمک ہوا کہ حاجن کے اکثر "وہاب شناس" لوگوں کے ذہن میں وہاب بحیثیت شاعر نہیں بلکہ بحیثیت قلندر بھی زندہ ہے۔

○

مضامین نگار

اپنے مضامین نظم ونثر اشاعت کے لئے بھیجدیجئے۔ ادارہ کو ضروری کانٹ چھانٹ کا حق حاصل ہوگا۔ جواب طلب امور کے لئے ٹکٹ آنا لازمی ہے۔

"مدیر"

پنڈت ناظر

ابتدائیہ

کشمیر میں فنِ رقاصی

زمانہ قدیم سے رقاصی کا فن ہماری اِس حسین و جمیل وادی کے رہنے والے انسانوں کی زندگی کا ایک اہم ترین مشغلہ رہا ہے۔ کشمیری فلسفیوں نے زندگی کو ایک رقص یا نغمہ سے تعبیر کیا ہے۔ اُن کے ہاں زمانہ (کال) رقص ہے، زندگی رقص ہے، موت رقص ہے، غرضیکہ تمام رقص ہی رقص ہے۔ وُہ اپنے معبودِ ازلی یعنی شیوجی مہاراج کو بھی رقاص دکھاتے ہیں۔ اور اِس کو نٹ راج کے نام سے موسوم کرتے اور رقاصوں کا بادشاہ پکارتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ شیوجی کا پسندیدہ ناچ "ٹانڈو" ہے اور پاربتی جو کہ اِس کی بیوی ہے، کا پسندیدہ ناچ "لاسیہ" ہے۔ ٹانڈو اور لاسیہ وہ محض ذرائع ہیں جن سے رُوحانی سکون اور عرفانی سرور حاصل کیا جاتا ہے۔

کشمیری ہندو اپنے عقیدہ کے اعتبار سے شیومت کے پیرو ہیں۔ وہ شری چکر یا شری وِدیا کی پُوجا کرتے ہیں۔ یہ پُوجا ظاہری اور باطنی دونوں طریقوں سے کی جاتی ہے۔ باطنی پُوجا کے لئے ہدایت ہے کہ وہ ناچ اور گانے بجانے کے ساتھ کی جانی چاہیئے۔ باطنی پرستش کا جب یہ حال ہو تو ظاہری پرستش کے کیا کہنے! کشمیر کے تمام معبدوں میں اگلے وقتوں میں ہر وقت ناچ گانا ہُوا کرتا تھا، خاص کر صبح اور شام کے وقت تو ہر مندر میں محفلِ رقص و سماع ضرور ہی منعقد ہوا کرتی تھی۔ مہاراجہ جلوک نے جو کہ آج سے کوئی دو ہزار (۲۰۰۰) برس پہلے کشمیر کا راجہ تھا ایک موقعہ پر اپنے محل سرا کی ایک سَو (۱۰۰) رقاصائیں مندر "جیشٹ رودرُ" واقع گپکار میں بطورِ نذر گذار دی تھیں۔ شاہی درباروں اور شریف گھرانوں کی رونق اسی کے دم قدم سے قائم تھی۔ یہ فن نسوانی طبقہ تک ہی محدود نہ تھا بلکہ مرد بھی اِس کے پرستاروں میں سے تھے۔ بچّے اور بچّیاں بھی اوائل عمر ہی سے اس فن میں مہارت حاصل کرنے میں کوشاں رہتے تھے۔

حُسن اور رقاصی کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ایک خوش گوار ورزش ہونے کے لحاظ سے رقص سے حُسن کا نکھرنا لازمی ہے۔ کشمیری گھرانوں کی سگھڑ مائیں اپنی بیٹیوں کو خود ہی رقص سکھاتی تھیں۔ مذہبی تقاریب پہ مرد اور عورتیں دونوں ہی ناچتے تھے۔ شادی بیاہ کے موقعوں پر عورتیں اور دوشیزائیں خُوب جی بھر کر ناچتی تھیں۔ چناں چہ یہ رسم اب تک چلی آ رہی ہے۔ رقاصی کی تکنیک تو اب مفقود ہے البتہ بے ہنگم سا ڈھانچہ ابھی تک باقی ہے۔

اِندرانی (مِس انڈیا) جو ۱۹۵۲ء کی حسین ترین ہندوستانی لڑکی مانی گئی ہے، ایک فن کار رقاصہ بھی تو ہے۔ رقاصی کا خوش گوار اثر کشمیریوں کی روزمرہ زندگی میں ابھی تک نُمایاں ہے۔ پایل اور پازیب کا رواج جو آج سے تیس چالیس برس پہلے عام تھا آج بھی کہیں کہیں پایا جاتا ہے۔ پایل کی جھنکار کو کشمیری شاعروں نے اپنے لوک گیتوں میں شدّت سے گایا ہے۔ کشمیریوں کی ایک جھتی ضرب المثل ہے۔ اور اِس میں رقاصی اور نغمہ کی ہم آہنگی کو بھی بہت کچھ دخل ہے۔ اس وادی میں مختلف قومیں صدیوں سے رہتی چلی آئی ہیں۔ ہندوؤں میں یُوں تو بے شمار ذاتیں تھیں لیکن ذات پات کی تمیز اُن کے یہاں بہت ہی کم تھی۔ کشمیر کے ایک راجہ چکرورمن نے دسویں صدی کے آغاز میں ایک رقاصہ ہنسی

کے ساتھ بیاہ کیا۔ وُہ اور اُس کے رشتہ دار مندروں میں باقاعدہ جاتے رہتے حالاں کہ وہ نیچ قوم سے تھی۔ اُس کی اولاد کو برہمنوں نے تمام شاہی حقوق سے نوازا۔

کشمیری تیوہاروں پر تو ناچ گانا اب ایک مذہبی رسم بن گیا ہے۔ سلطان بڈشاہ کے زمانہ میں یعنی پندرہویں[15] صدی کے آغاز میں بھی اس کا رواج تھا۔ جون راج اور شری ور جیسے بڈشاہی مورخوں نے جشنِ نوبہار کا ذکر تفصیل کے ساتھ کیا ہے۔ نیچ بہاڑہ میں جشن نوبہار منایا گیا۔ شاہی دربار کے سامنے ایک عالی شان سٹیج ترتیب دیا گیا۔ تارا نامی رقاصہ اور اُتسوہ نامی رقاصہ نے اپنی فن کاری سے بادشاہ اور عوام کو محوِ حیرت بنا دیا۔ انہوں نے ۴۹ انسانی جذباتِ لطیفہ کی عکاسی رقص کے ذریعہ دکھائی۔

ہاری پربت کے مقدس تیرتھ پر شری چکر کی پوجا ہوتی ہے۔ سولھویں[16] صدی کے وسط میں امیر شمس الدین محمد عراقی کشمیر میں تشریف فرما ہوئے۔ تحفۃ الاحباب نامی کتاب میں لکھا ہے کہ نوروز (نورہ) کے دن تمام گانے بجانے والے رقاص اور رقاصائیں اور عام لوگ ہاری پربت کے مندر میں پوجا کے لئے جمع ہوتے تھے اور باغوں میں کافی چہل پہل اور گہما گہمی رہا کرتی تھی۔ ہر جگہ ہاری پربت کے اردگرد سوز و ساز کی رنگین محفلیں گرم ہوتی تھیں۔ مسلمان عابدوں اور صوفیوں کے ہاں بھی مجالس سماع منعقد ہوتی تھیں اور متلاشانِ حق اکثر رقص کرتے تھے۔ ملکہ حبہ خاتون کے زمانہ میں کشمیر حضرت ایشان شیخ یعقوب صرفی رحمۃ اللہ علیہ کے نغماتِ روحانی سے گونج رہا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ فجر کے وقت جب حبہ خاتون موسیقی کا مقام عراق گا رہی تھی تو ذوقِ سماع سے حضرت ایشاں رحمۃ اللہ علیہ پر وجدانی کیفیت طاری ہوئی تھی۔ خواجہ حبیب اللہ نوشہری رحمۃ اللہ علیہ تو آٹھوں پہر استغراق اور وجدانی حال میں پڑے رہتے تھے۔ وہ رقص و سماع کو روحانی کیف اور سرور کا بہترین اور سہل ترین ذریعہ تصور کرتے تھے۔

سرینگر میں رقاصائیں ہر ایک محلے میں موجود تھیں۔ محلہ گور گاڑی، تاشہ وان اور گانی اٹمنز تو خاص طور پر اس کے مراکز تھے۔ آج سے ایک سو سال پیشتر تاشہ وان میں ایک رقاصہ عزیزہ نامی موجود تھی جو کہ ذوقِ ربانی سے سرمست اور سرشار تھی۔ ہفتہ میں ایک بار وہ مجرا کرتی تھی۔ بڑے بڑے قطب اور ابدال، سادھو اور یوگی اُس کی محفلِ رقص میں شرکت کرنے پر بھاری فخر محسوس کرتے تھے۔ وہ نہا دھو کر جب فارغ ہوتی تو تلاوتِ قرآن شریف میں منہمک ہو جاتی تھی اور اس کے بعد ناچ گانا شروع کرتی تھی۔ وہ پرانے مایوس مریضوں کا علاج اپنی نظر سے یا ہاتھ پھیری سے کیا کرتی تھی۔ گور گاڑی محلہ میں بالعموم سازندر (گانے بجانے والے) رہا کرتے تھے۔ رقاصائیں اس فن کے اُستادوں کی خدمت میں رہ کر رقاصی کی تعلیم حاصل کیا کرتی تھیں۔ کم سے کم پانچ سال کی تربیت پانے کے بعد وہ اس قابل ہو جاتی تھیں کہ بھری محفل میں اپنی فن کاری کی داد پا سکیں۔ گور گاڑی محلہ میں عید کا جشن خاص اہتمام سے منایا جاتا تھا اور اس روز تمام رقاصائیں اپنے اپنے اُستادوں کے گھروں میں آ جاتی تھیں اور ناچ مجرا کیا کرتی تھیں۔ تمام امراء و رؤسا اور رقص و رقاصی کے شوقین لوگ، اس خوشگوار تقریب پر اس محلہ میں آ جاتے تھے اور فنِ رقاصی کی داد دیتے تھے۔ شادی بیاہ کے موقعوں پر "حافظہ نغمہ" کا اہتمام کرنا ایک لازمی بات تھی۔ ساری رات ناچ گانا ہوتا تھا اور اس مجلس میں داخلہ کی فیس پندرہ روپیہ سے سو روپیہ تک ہوا کرتی تھی۔ اگر برات کو کہیں دُور جانا ہوتا تھا تو رقاصوں کے لئے تختِ رواں تیار کئے جاتے تھے۔ جنہیں کہار کندھوں پر اُٹھائے چلتے تھے اور وہ

بازاروں میں سے بہتے ہوئے اپنا ناچ مجرا کرتی جاتی تھیں۔

اگر دُلہن کے گھر تک دریائی راستے جانا ممکن ہوتا تھا تو ڈونگوں اور ہاؤس بوٹوں میں ناچ مجرا کی محفلیں گرمائی جاتی تھیں یشمدے اور بوالہوس دریا کے دونوں کناروں سے ساتھ ساتھ چلتے جاتے تھے اور دُور ہی سے واہ واہ اور مرحبا کی آوازیں دیتے جاتے تھے۔

"بچہ نغمہ" تو ہمارے دیہات میں مقبول ترین ناچ گانا ہے۔ خوش گلو اور حسین لڑکے پشواز پہن کر اب بھی کشمیر کے طول و عرض میں رقاصی کی مشعل کو روشن کر رہے ہیں۔ ہیجڑے بھی اپنے تئیں رقاصی کے فن کو اپنائے ہوئے ہیں۔ مگر اس مقدس فن کی جو مٹی ان کے ہاتھوں خراب ہو رہی ہے۔ اُس سے توبہ ہی بھلی!

رقاصی ہماری عظیم اور شاندار میراث ہے۔ ہمیں اس میراث کو دوبارہ فروغ دینا اور زندہ کرنا ہے۔ یہ کیسے اور کیونکر کیا جا سکتا ہے اس سے متعلق کسی دوسری صحبت میں اپنے خیالات کا اظہار کروں گا۔

⊙

یہ دو کتابیں

رباعیات عارف

ایک سو رباعیوں کا مثالی مجموعہ

قیمت مجلد ـــ ۲ روپیہ

لازوال خلوص، لامنتہائی جدوجہد کا شاعر، زندہ جاندار اور متحرک ادب پیش کر رہا ہے

زندگی کی مسلسل جدوجہد

نئے نظام عالم کا خاکہ

حال کی لازوال تصویر

بہترین لکھائی چھپائی

تعداد صفحات ۱۲۴

ہر رُباعی کے ساتھ اُردو ترجمہ

دیوان صرفی

(حصہ اوّل)

حضرت شیخ یعقوب صرفی رح کا وہ فارسی دیوان جو آج تک دُنیا کی نظروں سے اوجھل تھا اور جسے ہر شخص حاصل کرنے کا تمنائی تھا

کشمیر بزم ادب نے اسے حاصل کر کے شائع کرنے کا بیڑا اُٹھایا ہے۔ قلیل تعداد میں چھپنے کی وجہ سے اپنی جلد پہلے ہی سے رجسٹر کروائیں۔

ابو ریاض کاشمیری

عبدالاحد ناؔدم —— تعارفی خاکہ

دُنیا کے ہر ادب کے اپنے اپنے اصناف ہیں۔ رزمیہ شاعری ہے، بزم کی خاکہ کشی ہے۔ سراپا ہے، تغزّل ہے، منظر کشی ہے، واقعہ نگاری ہے، محاکات ہے اور اس کے علاوہ اقتصادی شاعری (POETRY) ہے ہر زبان میں جو شاعر ہوتے ہیں۔ اُن کا کوئی نہ کوئی خاص میدان ہوتا ہے فردوسی فارسی ادب میں اس لئے مشہور ہے کہ وہ رزمیہ شاعری میں بے مثال ہے سعدی کا درجہ اس لئے بلند ہے کہ اخلاقی شاعری میں اُس کا کوئی ہم پلّہ نہیں۔ اُردو میں انیسؔ نے مرثیہ نگاری کو آسمان اول پر پہنچا دیا ہے اور بقول ایک نقاد کے اپنے زور قلم سے شہید کربلا کو لکھنو کا دُولھا بنا دیا اس میں اس کا کوئی ہم سر نہیں۔ ایک اور بات قابلِ ذکر یہ ہے کہ ہر زبان میں کسی خاص صنفِ سخن کا شاعر دوسری زبانوں میں بھی اپنا نظیر ضرور رکھتا ہے۔ فارسی میں اگر فردوسی رزمیہ شاعری کا بادا آدم ہے تو کشمیری ادب میں وہاب پرے موجود ہے، فارسی ادب میں جامی نعتیہ شاعری کی وجہ سے ممتاز ہے۔ کشمیری میں اُس کا ہم سر عبدالاحد ناؔدم ہے آج ہم اس صحبت میں اسی بزرگوار کے متعلق کچھ باتیں کرنا چاہتے ہیں۔

عبدالاحد شاہ ناؔدم موضع گامرو علاقہ بانڈی پور کے رہنے والے تھا گامرو بانڈی پور سے دو میل دُور ایک شاداب اور پُر فضا گاؤں ہے جو دھان کے کھیتوں اور شفاف نالوں میں گھرا ہوا ہے۔ تاریخ کشمیر میں اس گاؤں کو ہمیشہ اہمیت حاصل رہے گی۔ اس لئے کہ اس نے کئی ممتاز شخصیتیں پیدا کی ہیں۔ ان میں سے کشمیر کے مشہور مؤرّخ حسن شاہ اُن کے والد غلام رسُول شیؔدا حسن شاہ کے بھائی غلام احمد جنیدؔ اور عبدالاحد شاہ ناؔدم خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ ناؔدم، حسن شاہ کے بھانجے تھے۔ فارسی اور عربی ادب پر مکمل عبور حاصل تھا۔ طبابت میں اپنے زمانے میں فردِ روزگار تھے، اور اسی سے اپنا معاش پیدا کرتے تھے۔ زہد و تقویٰ ریاضت اور دیانت کا یہ عالم تھا کہ کبھی کسی کے ہاں کھانا نہیں کھاتے تھے۔ مریضوں کو دیکھنے صبح نکلتے تو دن کا کھانا ساتھ اُٹھاتے، اور جہاں وقت ملتا، کھا لیتے۔ اللہ والدِ مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ اُن کے بڑے دوست اور مُربّی تھے۔ وہ ایک واقعہ اکثر بیان کرتے تھے۔ کہتے تھے۔ میں ایک روز ہاڑ ساون کے مہینے میں ایک گاؤں سے بانڈی پور واپس آ رہا تھا، سخت گرمی پڑ رہی تھی، دُور سے ناؔدم کو آتے دیکھا۔ وہ اُن دنوں ضعیف العمر تھے، جب ہم دونوں ملے تو میں نے اس چلچلاتی دھوپ میں پیدل چلنے کا سبب پُوچھا، ناؔدم پسینے میں شرابور تھے، ایک درخت کے سائے میں مجھے لے گئے، اور کہا ایک مصیبت میں گرفتار ہوں، تم سے اس کا حل دریافت کرنا ہے، میں نے پُوچھا کیا بات ہے، فرمایا، کل شام اس سامنے والے گاؤں سے ایک آدمی آیا، اور کہا میری والدہ بیمار ہے، آپ اُسے دیکھیں، میں اس کے ساتھ چلا گیا، وہاں جا کر مجھے معلوم ہوا کہ مسافر رختِ سفر باندھ چکا ہے، اور اب صرف چلنے کی تیاری ہے، میں نے اس آدمی سے کہا، مریض مایوس العلاج ہے، اللہ قادر ہے، وہ چاہے تو شفا بخش سکتا ہے، چلتی دفعہ اس آدمی نے مجھے آٹھ آنے دیئے، میں نے لینے سے انکار کیا، مگر وہ بضد رہا۔ اور جبراً میری جیب میں ڈال دیئے۔ آج صبح مجھے معلوم ہوا کہ مریض چل بسا ہے، اب میں وہاں جا رہا ہوں، وہ آٹھ آنے واپس کرنے لیکن عقدہ یہ ہے کہ رات بھر کسی دوسرے آدمی کا میری جیب میں پڑا رہا۔ کہیں اس کے لئے مجھے مواخذہ تو نہیں ہوگا؟ —— والد مرحوم یہ واقعہ بیان کرتے اور اشکبار ہو جاتے، اور فرماتے کہ میں دیر تک اس عالم کی طرف صرف دیکھتا رہا، آخر وہ اپنی منزل کو روانہ ہوا، اور میں نے اپنی راہ لی، میں دیر تک اس واقعہ سے متاثر رہا۔ اور سوچتا رہا۔

ایک ہم ہیں کہ لیا اپنی بھی صورت کو بگاڑ
ایک وہ ہیں جنہیں تصویر بنا آتی ہے

بڈگام کے پاس ایک گاؤں بٹہ ہار ہے، آخر میں آپ وہاں منتقل ہو گئے تھے، اُن کے بیٹے بھی وہیں رہے، یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ وہ ساری عمر اپنے بیٹے سے ناراض رہے، اور کبھی اُن کے ساتھ نہ بولے بٹہ ہار سے ایک روز والد مرحوم کو خط لکھا، وہ خط اُن کے پاس محفوظ تھا، اور میں نے کئی بار پڑھا ہے، اُس کا پہلا جملہ مجھے اب تک یاد ہے وہ یہ تھا

"نورُ الابصار! سلمہ الغفار۔ پسرِ ناہنجار۔ خلفِ بد کردار نجم [illegible] دیروز بوقت نصف النہار وارد بٹہ ہار گردید۔"

سارا خط اسی طرح مسجع تھا، اور لطف یہ ہے کہ اس کے بعد [illegible]

زبانی میں کوئی فرق نہ آنے پایا تھا، اس سے نادم کے فارسی علم و ادب کا تھوڑا سا اندازہ ہوتا ہے۔ کہتے ہیں، لڑکپن میں وہ اور حسن شاہ مورخ اور دو سرے لڑکے گرمیوں میں اکٹھے اپنے مویشیوں کو گھاس کھلانے لے جاتے۔ ایک دفعہ بھیڑوں کا بڑا زور ہوا، اور ان لڑکوں کو بہت تنگ کیا، اسی زمانے میں نادم نے ایک طویل فارسی مثنوی لکھی تھی، اس کا نام تھا "رہبہ نامہ" جس کے بزرگوں کو اس کا اکثر حصہ یاد تھا۔ لیکن ان کی وفات کے ساتھ ہی وہ اب یاد رفتگاں ہو گیا ہے۔ مجھے البتہ ابھی ایک شعر یاد ہے، جو حسن شاہ کی بے قراری کے متعلق نادم نے اس مثنوی میں لکھا تھا۔

حسن شاہ از ہول بگریختے ۔۔۔ گہے می نشستی دگہ ایستے

کہتے ہیں، اس زمانے میں نادم کی عمر پندرہ سولہ سال سے زیادہ نہ تھی۔ مجھے نادم کی تاریخ وفات یا تاریخ ولادت معلوم نہیں۔ البتہ سالِ وفات معلوم ہے، اس لئے کہ والدہ مرحوم نے اتقم کی تاریخ وفات لکھی تھی جو یہ ہے:

اے دریغا! سرو بُستان رشد ۔۔۔ جائے کردہ از قضا زیر لحد
طبع نازک گفت تاریخ وفات ۔۔۔ نعت خوان احمدی عبد احد

۱۳۲۹ ہجری

نادم کی قبر موضع گامُرد میں ہے۔

نادم کشمیری ادب میں وہی درجہ رکھتا ہے، جو جامی کو فارسی ادب میں حاصل ہے۔ جو شخص عشقِ رسول میں اس قدر سرمست ہے کہ اس کو بغیر کچھ اور نظر نہیں آتا، نادم کا جو کلام آج میسر ہے، وہ یا نعتیں ہیں، یا شمایل نبوی ہے، اور اس سے ہٹ کر ایک شہر آشوب ہے جو نادم کی نگاہوں سے اب تک پوشیدہ ہے۔ نادم کی نعتوں میں وہ سوز و گداز وہ خلوص، وہ عقیدت، اور وہ بے پناہ محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے کہ ہر دردمند پہ اُن کا ایک ایک شعر ایک ایک جھونکے کا کام کرتا ہے۔ زبان اس قدر صاف سلیس، اور پُر سوز ہے کہ سیدھے دل پہ اُتر جاتی ہے۔ نادم کی تمام نعتیں کم و بیش ایک ہی بحر میں لکھی گئی ہیں۔ اور وہ بحر ہے کشمیری "وَنہ وُن" (شادی بیاہ کے گیتوں) کا کہتے ہیں نادم نے خاص طور پہ یہ بحر منتخب کرلی تھی، تاکہ مسلمان عورتیں شادی بیاہ کے موقعوں پہ یہ نعتیں پڑھیں اور اس طرح آم کے آم گٹھلیوں کے دام حاصل ہو جائیں۔ اکثر پڑھے لکھے گھرانوں میں عورتیں شادی بیاہ کے موقع پہ یہی نعتیں پڑھتی رہتی ہیں۔ اس خیال کے پیش نظر زبان بھی انہوں نے وہی استعمال کی ہے۔ جو عام طور پہ عورتیں بولتی ہیں۔ اصطلاحات بھی عورتوں

کی ہیں اور اندازِ بیان بھی اُنہی کا، اس میں کشمیری شاعری کے اس اصول نے اور بھی چار چاند لگا دئے ہیں کہ ہندی کی طرح اظہار عشق کشمیری زبان میں بھی عورت کی جانب سے ہی ہوتا ہے۔ ایک نعت کے چند بند ملاحظہ فرمائیے۔

کَمہ وَتہ رَو ترووُ سرو قامتئے ۔۔۔ گر اَنہ پتہ پتہ لگہوس یار بہ
ژھاین تہ کرہوس نالے متئے ۔۔۔ مدنی مارہ متئے مار

(وہ سرو خراماں کون سے راستے چلا اُس کی خوش رفتاری کے قربان جائیے ہم اُس کے سائے کو بھی گلے لگائیں۔ مدینہ کے محبوب نے ہمیں دیوانہ بنا چھوڑا)

ڈِکہ تس نورکہ طور چ بتئے ۔۔۔ گاہ یلہ ترا وُ تمہ ماہ رُخسار
سا بدٕ آفتاب وِت تمہ پتئے ۔۔۔ مدنی مارہ متئے مار

(اُس کا ماتھا نور کا ایک چمکتا ہوا طور ہے۔ جب اُس ماہ رُخ نے جلوہ افروزی کی تو ہزاروں آفتاب ماند ہو کر رہ گئے ......)

اَسہ گے اندرِی نارہ تتئے ۔۔۔ لسہ ناروسہ ترووا سہ لبے آر
لسہ کتہ پَس آسہ لبے مرتئے ۔۔۔ مدنی مارہ متئے مار

(ہم اندر ہی اندر بھسم ہو کر رہ گئے ہیں۔ اُس بے پروا محبوب نے ہماری نس نس میں آگ بھڑکا دی۔ وہ جو اُس کا متوالا نہیں نہ جانے جی کیسے سکتا ہے)

معانی سے قطع نظر الفاظ کے انتخاب، بندش کی چستی اور قوافی کی سنگلاخی کے باوجود اُن کی شادابی پر نظر ڈالئے، تو ایک میٹھے پانی کا بہتا ہوا صاف و شفاف جھرنا نظر آتا ہے۔ اور پھر معانی کو دیکھئے تو سوز و گداز کا ایک چشمہ صاف ہے۔ استعارات اور تشبیہات کو نظر انداز کیجئے جو نہایت اچھوتی اور نادر ہیں۔ اور دل پر لگتی ہیں ایک مسلسل نعت میں یہ بیان کیا ہے کہ تمام انبیاء رسول مقبول صلعم کے خرمن کے خوشہ چین ہیں۔ اور ہر پیغمبر کے معجزے کا ذکر بھی اس صفائی اور خوبصورتی سے کیا ہے کہ طبیعت خوش ہو جاتی ہے۔ آپ نے ایک نعت میں حضور صلعم کا سراپا بھی لکھا ہے۔ اور اس موضوع پر نادم جم کر رقص کر رہا ہے۔ اس نعت کے چند بند بھی ملاحظہ فرمائیے۔

مَدَنی مطلعہ ماہِ آبانے ۔۔۔ شاہِ خُوبانے ہاوُ دیدار
قرشی مرسلہ عربی خوانے ۔۔۔ شاہِ خُوبانے ہاوُ دیدار

(اے مدینہ کے آکاش کے چمکتے چاند اور اے شاہ خوباں اپنے درشن دکھا اے قریشی مرسل اور عربی پڑھنے والے محبوب اپنے درشن دکھا)

نُوح اوس چونُی کشتیبانے پُشتہ چانہِ لب تم مدس تار
بُتھ لگ وارہ کارہ تمہِ طُوفانے شاہِ خوبانے ہاوُہ دیدار

(نُوحؑ تیرا ہی بھیجا کشتیبان تھا تیری ہی پُشت پناہی سے اُس نے تولج کیا۔ اور اُس طوفان سے صحیح سلامت کنارے لگا۔)

ابراھیمس چانہِ نُورانے نارِ نمرودس گوس گلزار
فرزند کرونے ژےٚ قربانے شاہ خوبانے ہاوُہ دیدار

(تیرے ہی نُور کے فیض سے نمرود کی آگ ابراہیم کے لئے گلزار بن گئی اُس نے تیرے ہی لئے اپنے بیٹے کو قربان کر دیا تھا)

شاہِ یوسف سوی ماہ کنعانے لیکھس درشن اک سمار
خرمنہ چانہ منزہ اوس اکھ دانے شاہِ خوبانے ہاوُہ دیدار

(وہ کنعاں کا چاند یوسفؑ جس کے ایک جھلک کی قیمت ایک جہاں تھا وہ تو تیرے ہی خرمن کا ایک دانہ تھا)

اسی نعت میں سراپا کے جو بند ہیں۔ ان میں سے چند ملاحظہ فرمایئے

دِکہ چون زہرہ زن درمیزانے ہفتچہ زُونہِ کھوتہ پُر انوار
طوبےٚ قد چون کیاہ شوبانے شاہ خوبانے ہاوُہ دیدار

(تیرا ماتھا جیسے زہرہ میزان میں ہے، ہفتے کے چاند سے بھی زیادہ آبدار تیرا طوبیٰ ایسا قد کیا ہی زیب دیتا ہے)

دند چانِ تابان نابد دانے دندہ مالہ چانہِ زن محنتہ ہار
خندہ وزہ بند چھوی شکرستانے شاہِ خوبانے ہاوہ دیدار

(نبات کے چمکتے دانوں ایسے تیرے دندان پاک اور موتی کی مالا ایسی تیرے دانتوں کی مالا ہے۔ تیری مسکراہٹ پر شکرستان بھی صدقے ہوتا ہے)

وُٹھ چانِ وزِل ارغوانے سرگچھ رنگہ ول، نتہ گلنار
لعل نتہ یاقوت نتہ مرجانے شاہ خوبانے ہاوہ دیدار

(ارغوان ایسے سرخ تیرے لب۔ جنت کے "رنگ ول" پھول یا گلنار جیسے سرخ یاقوت نہیں، بلکہ لولوکے مرجان)

والضحیٰ روےٚ چون شمسِ تابانے واللیل موےٚ چون عنبر یار
زُلفِ نیم تہ حامیم زاہانے شاہِ خوبانے ہاوُہ دیدار

(تیرا سورج ایسا والضحیٰ چہرہ، تیرے عنبر بار واللیل، یا جیم ایسے زُلف اور تیرا جسم ایسا دین پاک)

بہرحال سراپا میں کوئی چیز نہیں، جس میں نادم نے واقعہ نگاری محبت اور عقیدت کے علاوہ شاعری کا بھی پورا پورا حق ادا نہیں کیا ہے ایک اور نعت میں اپنے دِل کی بھڑاس نکالی ہے، اور حسب معمول ہوا کو پیغامبر بنا کر اپنی عرضداشتیں بارگاہِ رسالت میں پہنچوا دی ہیں، کہتا ہے،

حضرت نبیس لگہ ہا ناوس واوس اکھ ونناوس زار
سوال پاوس کو زھ چھو کاوس واوس اکھ ونناوس زار

(نبی صلعم کے نام کے قربان جاؤں میں بادِ صبا کی زبانی اپنا حال زار اُن تک پہنچاؤں۔ ان کے پاؤں پکڑوں اور منت و زاری کروں)

گرم آبہ اشہ کی کھورِی وَوس چشمہ زہ تہ وندہس تھاوِے سار
خشک لبہ سیت اُدہ پاد وتھراوس واوس اکھ ونناوس زار

(میں آنسوؤں کے گرم پانی سے اُن کے پاؤں دھولوں اور اپنی دو آنکھیں بچھا ور کروں اپنے سوکھے ہونٹوں سے اُن کے بدن کو صاف کروں)

میں نے اس سے پہلے کہا ہے کہ نادم نے ان نعتوں میں عورتوں کی زبان اور عورتوں کی اصطلاحات کا خاص التزام رکھا ہے، اس کا اندازہ آپ نے اوپر کی مثالوں سے کیا ہوگا۔ چند مثالیں اور سنیئے

نبیس کُن ہے گروے دیئے ژرئے درُودہ پرِ توسے
اوس سیت ہت چورہ تہ پیریئے ژرئے درُودہ پرِ توسے

(اے سہیلیو آؤ کہ ہم نبی کے گیت گائیں اور اُن کو لاکھ درود بھیجیں)

درُودہ سُوزتوس گنیز کتہ ژرِ سرُودہ تمکوُی سیرِ توسے
اَدہ ہاوہ درشن خوابہ اندریئے ژرئے درُودہ پرِ توسے

(اُن کو اَن گنت درُود بھیجیں تاکہ اُس کے سرود میں مست ہو کر وہ ہمیں خواب میں اپنے درشن دکھائیں)

حضور صلعم کو خطاب کرنے کے لئے جو الفاظ نادم نے چنے گئے ہیں، اُن سے اس گہری محبت، عقیدت اور لگاؤ کا پتہ چلتا ہے جو نادم کو حضور کی ذات بابرکات سے تھی۔ مثلاً

مگرس ڈاٹھس، مدنی لالس

معنوی لحاظ سے نادم کی شاعری میں حرف گیری کی کوئی گنجائش نہیں۔ ایک جگہ وہ حضور کی حیات کو صرف ایک بند میں ثابت کرتا ہے اور کہتا ہے

ابرہ پتھ آفتابہ بھوآسانی فاش نہ تہ گاش چھوہن پیدا وار
سو چھو تھو پیدا تہ بیہ پنہانی سُو چھو لا ثانی بانی کار

(بادل کے پردے میں جس طرح آفتاب ظاہر بھی نہیں ہوتا۔ لیکن اس کی روشنی چھپی بھی نہیں ہوتی اسی طرح وہ پیدا بھی ہے اور پنہاں بھی) غور کیجئے ایک بہت ہی بڑے مسئلے کو کس صفائی اور خوبی سے ایک معمولی مثال دے کر تہ کر کے رکھ دیا ہے۔ یہ صرف نادم کا حصہ ہے۔

نادم کے کلام سے بے شمار مثالیں دی جا سکتی ہیں، لیکن میرے سامنے اس وقت اُن کی نعتوں کا مجموعہ نہیں۔ اور یہ مثالیں میں نے محض اپنی یادداشت سے لکھی ہیں۔ اسی طرح نادم کا شہر آشوب بھی اس وقت میرے سامنے نہیں۔ اگر وہ ہوتا، آپ اندازہ کر سکتے کہ یہ شخص کس گہری نظر سے اپنے سماج کو دیکھتا تھا۔ اور اس کا تجزیہ اس نے کس شانِ دلربائی سے کیا ہے۔ مثلاً واعظوں کے وعظوں اور اُن کے زہرناک نتائج کے بارے میں لکھا ہے

میر واعظ پیر وتھدہ تھد کھارن لحن رٹت وعظ چھک ناہموار
فتنہ کتھ چھی فاٹن تارن تیزہ اوس تلہ گفارن عار

(واعظ اونچے سے اونچے منبروں پر جلوے دکھاتے ہیں، اُن کی آواز سریلی اور ان کے وعظ ناہموار ہیں۔ یہ عوام کو فتنہ و فساد کی باتیں سکھاتے ہیں۔ گئے زمانے میں کافر بھی ایسا نہیں کیا کرتے تھے)

فتنہ کتھ چھی عامن تارن خارہ وتھ خلقن بارہ آکھ یار
تُھوہ گے فرن تہ بیہ دستارن تیزہ اوس تلہ گفارن عار

(یہ عوام کو فتنہ و فساد سکھا رہے ہیں، لوگ تنگ آگئے ہیں لیکن ان کو تو پیسے ملتے ہیں اور ان کے یہاں شال دوشال اور دستاروں کے ڈھیر لگ گئے ہیں۔ گئے زمانے میں کفار بھی ایسا نہیں کیا کرتے تھے۔

واعظوں کی یہی بے راہ روی تھی، جس کے خلاف آج سے ۵۰ سال پہلے دلوں میں احتجاج تھا جس کا ثبوت نادم کے یہ دو بند ہیں۔ اور اس احتجاج نے ۲۵ سال کے بعد عملی صورت اختیار کر کے پایانِ کار اس فراڈ کو ہمیشہ کے لئے ختم کر کے رکھ دیا۔ آج اب نہ وہ واعظ ہیں، نہ وہ فتنہ انگیزیاں، نہ اس قسم کے جھگڑے ہیں۔ پہلے نہ واعظوں کو خردوں اور دستاروں کے ڈھیر ہی ملتے ہیں۔

مُلّا کے حرص اور لالچ نے اسے ہمیشہ ذلیل کیا ہے، لیکن نادم نے اس پر جو چوٹ کی ہے، شاید اس کا جواب کہیں اور نہ مل سکے۔ واقعہ کا واقعہ ہے اور مار کی مار۔

گانہ یلہ ٹھک گژھ خریدارن بارگہ پرہ ناوہ در بازار
ذلتی منہ بابہ کلہ کن لارن تیزہ اوس تلہ گفارن عار

(بازاری عورت کے خریداروں میں جب کمی ہو جائے تو وہ برسرِ بازار "بارگہ" (ایک طرح کی قرآن خوانی) پڑھاتی ہے، یہ ذلیل مُلّا منہ کے بل گرتے پڑتے اس میں شریک ہوتے ہیں۔ گئے زمانے میں کافر بھی ایسا نہیں کرتے تھے۔)

غرض سماج کا کوئی فرد اور کوئی گروہ نہیں جو نادم کے تیرِ نظر سے بچ کر نکلا ہو۔ اور حق یہ ہے کہ ہر شخص اور ہر گروہ کے کردار کی صحیح عکاسی کی ہے۔ اور آخر میں یہ کہہ کر خاموش ہو گیا ہے۔

وَنہ ہا بیہ کینہہ تت چھوس تارن عام لوگن ہند بد کردار
حدہ نٹ زیو پانہ اَدہ ما مارن تیزہ اوس تلہ گفارن عار

(عوام کے بُرے کام دیکھ کر کچھ کہنے سے ڈر محسوس کرتا ہوں۔ اپنی زبان کو قابو میں رکھنا ہی اچھا، نہیں تو گردن زدنی ان سے کیا دور ہے)

اس لحاظ سے کہ نادم نے اپنے سماج کی خاکہ کشی کی ہے۔ اسے کشمیری ادب کے مستقبل میں ایک نمایاں جگہ حاصل ہے۔ جو وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ اُسے ضرور ملے گی۔

آئندہ شمارے میں

روپہ بھوانی ــــــ ایک تعارف
کشمیر میں موسیقی
کشمیر کا فردوسی ـــ وہاب پرے
کشمیری شاعری پر ایک نظر

اور دوسرے مضامین نظم و نثر کا انتظار کیجئے۔ (مدیر)

رسول میرس کُن

رُم گیم شیشس بے گرٕ گو بانہٕ میوٗن	میرے شیشے میں بال آیا اور میرا پیمانہ بھونڈے طور پر کھنکنے لگا
ساقیا! وائیت رٹیاہ جانانہٕ میوٗن؟	اے ساقی! کیا میرا محبوب اسے ٹھونکنے بجانے کے بعد خرید لے گا؟
آمہٕ نِہ کھاسین بتھاوِمس ہس بھرِتھ	میں نے مٹی کے کچے پیالوں میں اُس کے لئے شراب اُنڈھیل دی تھی
تس ہتس سے، آو نے مستانہٕ میوٗن	وہ ہرجائی نہ جانے کہاں ہے، ہائے وہ میرا مدھ ماتا میرے پاس نہ آیا
زیوٕ کلے یم، اُچھ پُتِن کرہٕ نم شہن!	میری زبان گنگ ہو گئی اور میرے سانسوں[1] نے میری پتلیاں پھیر دیں
مٔرتہٕ تس پیہٕ، کس پتے دیوانہٕ میوٗن	میں اُس کے پیچھے دیوانی ہوں، وہ نہ جانے کس کا متوالا ہے!
ہیِر زنج وانِج کٔنی تکبیرہ چھس	میں قصائی کی دکان کے ایک ہی تکبیر سے کٹے ہوئے سر کے مانند ہوں
چھم مُدے مِہ مُلِ ہیم جانانہٕ میوٗن	میری پتھرائی ہوئی آنکھیں اس انتظار میں ہیں کہ میرا محبوب کب مجھے خرید لے
اُلفتچ تلوارہِ کُرنم یارہ اَڑ	محبت کے آرے نے مجھ پیپل کے درخت کو چیر کے رکھ دیا
چھس ونس منز کُس ونیس افسانہٕ میوٗن	میں دُور جنگل میں پڑی ہوں، میرے محبوب کو میرا حال کون سنائے
زُلف و رُخ کوٗہی سِر چھُ میرس کفر دین	محبوب کے زلف و رخ میں رسول میر کے کفر و دین کا راز ہے۔
دُن اندر پروانہ چھُہ دُردانہٕ میوٗن	ان دو کے درمیان، میں پروانہ وار اُس کے کان کی بالی میں اُلجھا ہوا ہوں
ہا شہودہ کہ شاہبازو! بوزِہ کُس	اے شہود کے شاہباز! کون ہے جو عارف کے سوز تک رہ پائے گا!
سوز عارف، روزہ بس افسانہٕ میوٗن	بس اتنا ہی تو ہوگا کہ دُنیا میں میرا ایک افسانہ باقی رہے گا۔

ا؎ مراد رسول میر

ا؎ ذو معنی لفظ ہے۔ دوسرے معنی "میرے شانہ محبوب نے میری پتلیاں پھیر دیں"

فاضل کاشمیری

رسولؐ میر تہ بوٗ

یقین کر تو رسُل میرو مےٚ منز انہار چھُوی چونُی — مےٚ منز گُفتار چھُوی چونُی، مےٚ منز کردار چھُوی چونُی
بہ چیانس لولہ باغس منز دِوان چھُس دِرس آزادی — اَدیبن شاعرن منز بوٗ گیوان طرزِ شہنشاہی
ژہ پننے سوزہ باغس منز کرمتھ سازِ چمن پیدا — مےٚ پننے سازہ مُلکس منز کرُم سوزِ وطن پیدا
چھِ چیانے شوقہ سیئت گُل کارِوان دِرکاروان نیران — چھِہ ہیانے لولہ بُلبُل نالہ دِیوان گُل بدن ییران
ژہ وردس پیٹھ چھُو اُش ہارن مےٚ وطنس پیٹھ چھُپہ یا مُرن — ژہ حُسنک اِبتدا اَژھارُن مےٚ عِشقک اِنتہا گارُن
خیالن چیان دیُت مُت جوش پوشن گُلستانن منز — بیانن میاَن طوٗفاں تُل زمینن آسمانن منز
ژہ ہاوُن ماہ روین ہُند ستم، اُلفت تہ بے دردی — مےٚ ہاوُن جوش تےٚ مستی، جوانی تےٚ جواں مردی
ژہ ما چھُوی زِنھ کنن گومت زمانُک رنگ بدلیومُت — جہانُک تےٚ زمینُک آسمانُک رنگ بدلیومُت
ولیکن یتھ زمانس منز تہ قائل پرانہ اِنسانک — سوگامی خواجہ لولابک تہ بیہ بوٹہ راجہ اسکردُک
مےٚ پننے محنتگ ہر جا زمیندار ہر تہ تر کھیاون — مگر چلدار پاون، جامہ ژٹہ راون، زہر کھیاون
مےٚ دیُت پیغامِ آزادی نیٚین بالن تہ کُہسارن — سرن چشمن، جوٗین تےٚ آبشارن تےٚ کولن، بالن

کھورن تل گریتس ساری جہانُک کلہ نمراون
زمین کیاہ آسمانس پیٹھ بوٗ تمُسند جنڈہ لہراون

فاضل کاشمیری

(ترجمہ)

رسول میر اور میں

اے رسول میر یقین مان کہ تو ہی میرے روپ میں جلوہ فرما ہے — مجھ میں تیری ہی گفتار، تیرے ہی کردار کا رنگ جھلکتا ہے

میں تیرے محبت کے گلشن میں آزادی کا پیغام دے رہا ہوں — میں ادیبوں اور شاعروں میں اونچے ڈھنگ کے گیت گاتا ہوں

تو نے اپنے سوز سے چمنستان میں محبت کا ساز چھیڑ دیا — میں نے اپنے ساز سے ملک میں وطنیت کا سوز پیدا کیا

تیرے شوق میں پھول کارواں در کارواں کھلتے ہیں — میری محبت میں بلبل آہ و زاری کرتے اور پھول گریبان چاک کرتے ہیں

تجھے درد محبت میں آنسو بہانا ہے اور مجھے وطن کیلئے جان دینا ہے — تجھے حسن کی ابتدا ڈھونڈھنا ہے اور مجھے عشق کی انتہا تلاش کرنا ہے

تیرے تخیل نے چمن کے پھولوں کو رنگ و بو عطا کیا — میری گفتار نے زمین اور آسمان میں ایک تھلکہ مچا دیا

تجھے حسیناؤں کی محبت اور اُن کی خود رائی کے گیت گانے ہیں — مجھے جوش، مستی اور جواں مردی کے ساز چھیڑنا ہیں

کیا تو نے نہیں سنا کہ اب زمانے کا رنگ بدل گیا ہے — اس زمین اور اس آسمان نے ایک نئی کروٹ لے لی ہے.

اس زمانے میں بھی ابھی پرانی وضع داریاں باقی ہیں! — تولاب کے سوگامی امیر زادوں اور اسکردو کے راجوں کو دیکھ

مجھے کسانوں کو اپنی محنت کا پورا پورا ثمرہ کھلانا ہے — مجھے جاگیرداری اور چک داری کو مٹی میں ملانا ہے

میں نے جنگلوں، بنوں اور کوہساروں کو پیغام آزادی دیا — میں نے ندی، نالوں، دریاؤں اور آبشاروں میں جوش بھر دیا

میں کسانوں کے پاؤں کے نیچے ساری دنیا کے سر جھکاؤں گا — زمین کی بات ہی کیا ہے، آسمان پر بھی اُن کا جھنڈا لہراؤں گا

اے شاہ آباد کے شیرین سخن اور شاعر اعظم تو بھی اُٹھ
تیری فن کاری کے سامنے سب شاعر سر بہ خم ہیں!

پیغمبرِ شاعری

شاعری ہنُدِ آسمانُک آفتاب
پوشہِ وارِین ہُند تھیکوُن اڈہ پھُول گلاب
عشق وٕ مستی ہُند سپہ سالارِ شوق
لولہِ چِین تارن ہوٚلُک دردُک رباب
یُد وٕنے بوزکھ کنے اکھ اکھ شعر
ترجمانِ حُسن، تفسیرِ شباب
کن، کنن تھٕپ دِت چھ بوزان لولہ ساز
دِل، وٕچھس اندر رٹِت دردٕچ کتاب
رُف تُسند وٕنہ نے ہیوٚان وٕگنے نژُن
حوٗرہ وٕنہ وُن بوزنے درپیچ و تاب
عشقہ کِس بازارہ کوٚہی ژھٹہ وُن یہِ نار
حُسنہ کِس انہارہ جِگرن ہُند کباب
شاہ بادُک بادشاہِ شاعری
دردہ سوزکہِ شہرہ کوٚہی خانہ خراب
وادی کشمیرٕ ستی منز شاعری ہُندی رسوٗل
اتھ کلامس شعرس پیغمبری ہُندی خطاب

شاعری کے آکاش کا جگ مگاتا ہوا سورج
چمنستان کا مہکتا ہوا ادھ کھلا گلاب
عشق و مستی کے میدان کا متوالا سپہ سالار
درد و سوز کے بربط اور محبت کے تاروں کا لافانی نغمہ
اگر میں اُس کے شعر چھیڑدوں اور تو اُنہیں سُنے
ان میں سے ایک ایک حُسن کا ترجمان اور تفسیرِ شباب ہے
انسان کے کان بند ہوتے ہوئے بھی محبّت کا ساز سُنتے ہیں
انسان کا دِل درد و سوز کی کتاب اپنے اندر چھپائے ہوئے ہے
اُس کے تیوہاری گیت چھیڑنے سے پہلے ہی پریاں ناچ اُٹھتی ہیں
اُس کی سہاگ گھڑیاں گانے سے پہلے ہی حُوریں جھوم اُٹھتی ہیں
عشق کے کھلیان کا وہ دہکتا، بھڑکتا ہوا شعلۂ نار
حُسن کی خودرائیوں سے وہ بھُنے ہوئے جگر کا ایسا کباب
شاہ آباد کی سرزمین کا وہ بادشاہِ شعر و شاعری
درد و سوز کے ملک کا وہ خانہ خراب انسان
کشمیر کی وادی میں —— وہ شاعری کا رسُول
اُس کے کلام پر اُس کو پیغمبری کا خطاب دینا چاہیئے تھا۔

محی الدین نوازؔ

غزل

چھا دل وَنانی تتھ دِلس یتھ بے قراری نہ
چھا گُل وَنانی تتھ گُلس یتھ مُشک جاری نہ

کیا اُس دل کو کوئی دل کہہ سکتا ہے جس میں بے قراری نہ ہو
کیا اُس پھول کو کوئی پھول کہہ سکتا ہے جس میں خوشبو نہ ہو

پوشیدہ چھُو نہ روزان لولک سر پھٹت نیران
بُلبُل سُو عاشق چھا گُلن کِس نالہ و زاری نہ

محبت کا بھید چھپائے نہیں بنتا، وہ تو ظاہر ہو ہی جاتا ہے
وہ بُلبل متوالی کیسی، جو پھولوں کے لئے آہ و زاری نہ کرے

سینس اندر رَٹھ داغ لالک پاٹھ بِہہ در باغ
کُس سینہ وَنہ تتھ سینس یتھ زخم کاری نہ

اپنے سینے میں لالے کی طرح داغ پیدا کر اور پھر [illegible] بیٹھ
وہ چھاتی چھاتی تو نہیں کہی جا سکتی جس پر کاری ضرب نہ لگے ہوں

تِمہ ہُمہ کتہ محراب حُسنچ مسجدس اندر
یمہ شاد و خندان خشمہ پاٹھ چار پاری نہ

حُسن کی مسجد میں وہ ابرو محراب تو نہیں بن سکتے
جو مسرت سے پھیلے اور غصے سے سکڑے ہوئے نہ ہوں

سُوی پادہ ہرن ہانگلن از تیرِ غمزہ مان
آسَن تمس یمہ چشمہ پُر نم اشک جاری نہ

وہی شخص ہرنوں اور بارہ سینگوں کا ناوک تیر سے شکار کرتا ہے
جس کی آنکھوں میں آنسو تو ہوں لیکن کبھی چھلکنے نہ پائیں

مَنہ منز اندریس لولہ نارن آسہِ کرمُت سُوہ
تَس زانہ کُس یُس تنہ تنگل لار ہی نہ

جس کے دل میں محبت کی آگ نے اندر ہی اندر غضب کر ڈالا
اس کا کیا ثبوت جب تک کہ اُس کے جسم پر پھپھولے نمودار ہوں

سازِ خطا، رازِ عطا نانان تَے وایان
نازِ محی الدین وچھ ادَے تَس شرمساری نہ

غلطیوں کا ساز بجاتے ہوئے اور بخشش کے نغمے گاتے ہوئے
دیکھ کہ محی الدین کس ناز و ادا سے آیا وہ خود سے شرمسار نہیں

حامدیؔ کاشمیری

جو خونِ قلب سے رنگیں تری حیات نہیں
سمجھ لے عشق میں حاصل تجھے ثبات نہیں

ہر ایک لمحہ تیری یاد میں گذرتا ہے
میں بے نیاز رہوں تجھ سے ایسی بات نہیں

مرے لبوں کے تبسم کو چھیننے والو
بتاؤ اس میں نہاں تلخیٔ حیات نہیں

کوئی ستارہ گجردم یہ کہہ کے ڈوب گیا
جو صبح خیز نہ ہو، ایسی کوئی رات نہیں

کریم نواز! تو جوشِ جنونِ دل پر نہ جا
ابھی نگاہ کو تابِ تجلیات نہیں

ارے او کیفِ محبت میں ڈوبنے والو
غمِ زمانہ سے ممکن کہیں نجات نہیں

زمانے بھر کو شکایت ہے حامدیؔ تجھ سے
کہ تو اسیرِ قیودِ تعینات نہیں

افسرؔ یزدانی

وہ شمعِ حسن ہے، مجھے پروانہ جانئے
پروانہ جانئے، مجھے نذرانہ جانئے

میرے جگر کی آتشِ سوزاں نہ پوچھئے
جس پر گری ہو برق وہ کاشانہ جانئے

ساقی نے آنکھ اٹھائی ہے محفل ہے جوش میں
پیتے ہیں بے حساب لبِ پیمانہ جانئے

ہاتھوں میں ایک ایک کے ساغر نہ مانئے
آنکھوں میں ایک ایک کی خمخانہ جانئے

محفل میں آج ہم سے وہ آنکھیں چرا گئے
اپنا بنا کے کہہ دیا اپنا نہ جانئے

واعظ پرے پرے کہ یہاں آنا بھی جرم ہے
ساغر کھنک رہے ہیں یہ مے خانہ جانئے

افسر جنونِ عشق میں ہو جاؤ مبتلا
ہوش و خرد کے نام کو بیگانہ جانئے

پریم ناتھ پردیسی

مہمان

ہاؤس بوٹ کے اگلے ڈیک پر وہ ایک خاص وجدانی کیفیت میں گا رہا تھا۔

"جیا بے قرار ہے، آئی بہار ہے
آجا مورے بالما تیرا انتظار ہے"

وہ بار بار شنکر آچاریہ کی پہاڑی کی طرف دیکھ رہا تھا، مسکرا رہا تھا، اور گا رہا تھا۔

"آجا مورے بالما تیرا انتظار ہے"

اس کے آگے نیلے پانی سے بھرپور ڈل انگڑائیاں لے رہا تھا۔ اور دور بلوارڈ کی سرمئی سڑک ڈل کے ارد گرد بل کھاتی ہوئی جا رہی تھی ایسے معلوم ہوتا تھا کہ پہاڑی ایک رقاصہ ہے اور ڈل اس کے پھیلے ہوئے نیلے لہنگ کا دامن سیّاح پہلی بار سری نگر آیا تھا، اتنا پانی، اتنا سبزہ، اتنے درخت اور مسکراتی ہوئی جواں پہاڑیوں کا لاانتہا سلسلہ دیکھ کر وہ جھوم رہا تھا۔ خدا جانے اُس نے یہ فلمی گیت کہاں سے سُنا تھا جسے وہ آج بار بار دُہرا رہا تھا، جیسے سچ مچ اُسے کسی کا انتظار ہو۔

ہاؤس بوٹ کے پیچھے کچن بوٹ لگا ہوا تھا جس میں بوڑھا ہانجی مٹی کے ایک غلیظ حقے سے دھوئیں کے لمبے لمبے کش کھینچ رہا تھا۔ اُس نے سیّاح کو ڈیک پر گاتے سُنا، تو اُس کے ہونٹوں پر ایک ملال آمیز مسکراہٹ پھیل گئی۔ اُس کا بیٹا بھی اکثر یہی گیت گایا کرتا تھا۔ خاص کر اُس وقت جب وہ سپرنگ والے شکارے میں کسی سیاح کو لیکر کبوتر خان کے جزیرے کی طرف نکل جاتا تھا۔

لیکن اب پچھلے دو برس سے اُسے بیٹے کا کچھ علم نہ تھا۔ وہ اُسے غائب ہو گیا تھا۔ جیسے ایک متلاطم سمندر میں بے مایہ کنکر، اُس کی بیوی اب تک اُس کا انتظار کر رہی تھی اور ساتھ ہی چار سال کی بچی شمع بھی۔ بوڑھے نے اُسی کے لئے ہاؤس بوٹ بنوایا تھا، لیکن سال کے بعد ہی بیٹا غائب ہو گیا۔ اور تب سے اُس کا ہاؤس بوٹ خالی رہتا تھا بوڑھا اسے کرائے پر لگاتا تو کیسے؟ کرایہ دار کی خدمت کون کرتا، کھانا کون پکاتا، ہاؤس بوٹ کی صفائی کون کرتا، بوڑھے کا ذریعہ معاش شکارے کی مزدوری تھی جس پر وہ صبح سے شام تک دو اڑھائی روپیہ کما لیتا تھا۔

بوڑھے نے سیاح کو بھی ہاؤس بوٹ کرائے پر دینا منظور کیا تھا۔ لیکن وہ ہاؤس بوٹ کا فرنیچر اور ساز و سامان دیکھ کر ایسا ریجھ گیا کہ وہ اُسے چھوڑنے پر رضامند نہ ہوا، اُس نے کھانا پکانے اور خدمت گذاری کے لئے اپنے نوکر رکھ لئے اور بوڑھا مان گیا۔ پھر بھی اُس کے دل میں ایک نامحسوس قسم کی بے اطمینانی تھی۔ کہیں سیّاح کے نوکر فرنیچر خراب کریں یا چولہے میں چنگاری نہ رکھ چھوڑیں جس سے خدانخواستہ آگ لگ جائے۔ وہ صبح اور شام اور کبھی کبھی دوپہر کے کھانے پر بھی سارے ہاؤس بوٹ کا چکر لگاتا، اور گھور گھور اپنے سامان کو دیکھتا، اُسے یقین تھا کہ اُس کا بیٹا واپس آئے گا، وہ مرا نہیں ہے، زندہ ہے۔ شمع کے چہرے پر اُسے یتیمی کی ایک بھی علامت نظر نہ آتی تھی۔

سیّاح کی گنگناہٹ سے اُس کے سینے کے زخم کھل

گئے۔ اُس کے مُنہ سے خود بخود حُقّے کی نے چھُوٹ گئی اُسے محسوس ہو رہا تھا جیسے اُس کا بیٹا ہاؤس بوٹ کے ڈیک پر کھڑا گنگنا رہا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ اپنی جگہ سے اُٹھا اور ہاؤس بوٹ کے باہر لگے ہوئے تختے پر سے ہوتا ہوا ڈیک کے نزدیک پہنچا۔ وہ بدستور گا رہا تھا "آجا مورے بالما تیرا انتظار ہے"۔ اُس کے قدموں سے ہاؤس بوٹ میں ہلکی سی حرکت ہو گئی۔ سیّاح نے مُڑ کر دیکھا، بوڑھا حیرت بھری نظروں سے اُسے دیکھ رہا تھا۔

"حضور" بڑی مُشکل سے یہ الفاظ بوڑھے کے مُنہ سے نکلے

"کیا ہے بڑے میاں!"

بوڑھے کی آنکھوں سے آنسوؤں کے دو قطرے ڈھلک گئے

سیّاح اُس کے قریب آگیا "کیا ہُوا؟"

"یہ مت گاؤ حضور، یہ بُرا ہے" بوڑھے نے کہا

"بُرا ہے کیسے بُرا ہے" اُس نے مُسکراتے ہوئے انداز میں پُوچھا۔

"یہ ہمارا بیٹا گاتا تھا رزاق اور وہ غائب ہو گیا" کہتے کہتے بوڑھے کا گلا بھر آیا۔ "وہ اب نہیں آئے گا حضور" وہ برابر کہتا گیا، اور سیّاح حیرت سے اُس کی باتیں سُنتا رہا حتیٰ کہ بوڑھا شمع کی آواز سُن کر اپنی داڑھی پر بکھرے ہوئے آنسو پونچھتا ہُوا واپس چلا گیا۔

سیّاح وہیں پڑی ہوئی کُرسی پر بیٹھ گیا۔ بوڑھے ملّاح کی باتیں یکے بعد دیگرے اُس کے دماغ سے ٹکرا رہی تھیں "یہ ہمارا بیٹا گاتا تھا رزاق، اور وہ غائب ہو گیا۔ وہ اب نہیں آئے گا۔ یا شاید آجائے مگر کیسے آئے گا" وہ زیادہ دیر کے لئے ڈیک پر نہیں بیٹھ سکا۔ وہ اندر گیا۔ ہاؤس بوٹ کی دہلیز کو چیرتی ہوئی اُس کی نظر کچن بوٹ تک گئی، جہاں بوڑھا ملّاح معصوم شمع کو سینے سے لگائے آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اُس نے آواز دی — "عُمہ"

نوکر آگیا۔

"عُمّہ" اُس نے پُوچھا "بوڑھے مانجھی کا بیٹا ہے؟"

"وہ غائب ہو گیا ہے حضور —"

"غائب ہو گیا ہے؟"

"ہاں حضور —"

"وہ اچھا آدمی تھا؟"

"بہت خوبصورت جوان تھا حضور، اتنا بڑا سینہ موٹا موٹا ہاتھ، خُدا جانتا ہے کِدھر گیا"

"وہ چھوٹا بچہ کون ہے؟"

"وہ اُس کی لڑکی ہے حضور"

"گُڈ — شادی کیا تھا اُس نے؟"

"ہاں حضور کیا تھا۔ بوڑھے کے ساتھ ہی اُس کا گھر والی رہتا ہے حضور — کہتا ہے ہمارا خصم آئے گا"

"NON SENSE"

"حضور چائے پیئے گا؟"

"تھوڑا تھوڑا پیئے گا"

نوکر چلا گیا۔ اور سیّاح ڈرائنگ روم میں ٹہلنے لگا، دیوار پر چند تصویریں تھیں۔ وہ اُنہیں دیکھنے لگا۔ لیکن یُوں بھی اُسے سکون نہ مِلا۔ اُسے اب ساری بات سمجھ میں آگئی اور اُسے اندر ہی اندر افسوس ہو رہا تھا کہ اُس کی گنگناہٹ نے بوڑھے کے مُندمل زخموں کے ٹانکے کھول دئے تھے وہ پھر ڈیک پر نکلا۔ سورج ڈوب رہا تھا۔ اور ڈل کے پانی پر ارغوانی بادلوں کا عکس ناچ رہا تھا۔ بلوارڈ کے کنارے سفیدے اور بید کے درخت نئی کونپلوں کے ہار پہنے جھوم رہے تھے اور دُور کبوتر خان سے دو شکارے ساتھ ساتھ چلے آ رہے تھے تھوڑی دیر کے بعد سارے ماحول پر اندھیرا رینگنے لگا بادلوں کی سُرخی مہیب سیاہی میں بدل گئی۔ فطرت کی

رقاصہ کا رنگین دامن سکڑ گیا اور ہاؤس بوٹ اور شکارے ایسے نظر آنے لگے جیسے کسی مفلس کے گھر میں بھوک سے سہمے ہوئے بوڑھے اور بچے سر جھکائے اونگھ رہے ہوں۔ سیاح کے دل میں کشمیر کے متعلق نفرت کا ایک ہلکا سا جذبہ پانی کے بلبلے کی طرح ابھر آیا۔ وہ اپنے وطن کے غیر جذباتی ماحول سے اُکتا کر کشمیر کی بہار دیکھنے آ گیا تھا۔ لیکن تیسرے ہی روز جب مسرت آمیز سکون نے اُسے گدگدانا شروع کیا تھا۔ بوڑھے ملاح کے آنسو اور اس کی یاس انگیز باتیں برفانی سِل کی طرح اُس کے دل پر بیٹھ گئی تھیں۔

وہ دیر تک بجلی کی روشنی میں آنکھیں بند کئے بیٹھا رہا لیکن اُسے کچھ معلوم نہ ہو سکا، کہ بوڑھے کا بیٹا کہاں گیا ہے۔ وہ کیسے غائب ہو گیا ہے۔ گلاب کی پنکھڑی جیسی شمع کو چھوڑ کر وہ کہاں چلا گیا ہے اُس کی سمجھ ہی میں نہ آیا کہ لوگ اپنی بیوی اور بچوں کو چھوڑ کر بھاگ کیسے جاتے ہیں۔

رات کا کھانا کھاتے کھاتے اُس نے پھر اپنے نوکر سے پوچھا۔ "عمہ، تم جانتا ہے بوڑھے کا بیٹا کہاں ہے؟"

"ہم کو کیا خبر ہے حضور، ہم شونہ وار کا رہنے والا ہے اور یہ ہانجی لوگ ہے"

"ہانجی شونہ وار کا نہیں ہوتا ـــ"

"نہیں حضور ہانجی بوٹ کا ہوتا ہے، اور ہم مکان کا ہوتا ہے"

"I SEE"

"اس کا ایک بہو ہے حضور، بڑا خوبصورت اور معصوم مگر ہر وقت ملول رہتا ہے"

"کیوں"

"روتا رہتا ہے اپنے مرد کے لئے"

"ہم نے نہیں دیکھا ـــ"

"وہ شرماتا ہے حضور۔ کشمیر کی لڑکی پرائے کو منہ نہیں دکھاتا پردہ کرتا ہے"

"کیوں؟"

"بس ایسے ہی حضور ـــ کہتا ہے عورت کی عزت اُس کا پردہ ہوتا ہے"

"SILLY" "ہم بوڑھے سے بات کرے گا۔ اگر وہ خوبصورت ہے، بیوٹی فل ہے تو اُس کا بچہ بھی بیوٹی فل ہوگا، بیوٹی فل گرل کو ہمیشہ شادی کرنا چاہیئے، دوسرا شادی، تیسرا شادی، چوتھا شادی ـــ"

"مگر ہمارے ملک میں یوں نہیں ہوتا حضور۔ ہم عزت کے لئے مرتا ہے"

"عزت کے لئے ـــ؟" اِسے اعتبار نہیں آیا، اور وہ زور زور سے ہنسنے لگا۔

"ہم سچ کہتا ہے حضور، یہاں کا لوگ عزت کے لئے مرتا ہے" نوکر نے اپنی بات پھر دہرائی اور چلا گیا۔

ساری رات سیاح اِنہی خیالات میں غرق رہا ـــ کشمیر آنے سے پہلے اُس کے ذہن میں جو تصویر نقش ہو چکی تھی وہ آہستہ آہستہ مٹنے لگی۔ لیکن ہر طرف قدرت کی بے پناہ مینا کاریوں اور بیحد حُسن کو دیکھ کر بھی وہ یہ نہ سمجھ سکا کہ اس ملک میں اتنی غریبی کیوں ہے۔ اگر غریبی ہے تو اتنی خودداری کیسے ہے۔

دوسرے دن صبح وہ وقت سے پہلے جاگا شنکر آچاریہ کی پہاڑی کے پیچھے مارچ کا سورج طلوع ہو رہا تھا۔ وہ مارننگ گون پہن کر منہ میں سگریٹ دبائے ڈیک پر آ گیا۔ ڈل کا پانی خاموش تھا۔ چھوٹی چھوٹی مچھلیاں صاف و شفاف پانی کے نیچے تیر رہی تھیں۔ پہاڑی کا نوخیز سبزہ مہک رہا تھا اور اور شاہی محلات کی سفیدی ڈل کے پانی میں ڈوب رہی تھی اُس نے دیکھا۔ قدرت کی رقاصہ کا دامن آہستہ آہستہ پھیل کر رنگین ہو رہا ہے۔ خاموش نغمے رات کی تنہائی اور تاریکی

کے بعد ایک بار پھر جاگ رہے ہیں۔ صبح کی ہوا بید اور سفیدے کی کونپلوں کو گدگدا رہی ہے۔ اُس نے مُڑ کر دیکھا بوڑھے ملّاح کی بہو ہاتھ مُنہ دھو کر کچن بوٹ کی طرف جا رہی تھی۔ وہ یقیناً خوبصورت تھی۔ گلاب کے پھُول کی طرح سُرخ جسے صبح صبح شبنم نے نہلایا ہو۔ وہ اُسے دیکھتا رہا، دیکھتا رہا جب تک وہ بوٹ میں داخل ہوگئی۔ جہاں سے شمع کے رونے کی آواز آ رہی تھی۔

اُس نے سوچا۔ عُمر ٹھیک کہتا ہے۔ بوڑھے کی یہ لڑکی بڑی بیوٹی فُل ہے۔ لیکن اُس کا سارا حُسن بدن کے چیتھڑوں نے ایسا دبا دیا ہے۔ جیسے راکھ کسی نئی چنگاری کو دبا لیتی ہے پھر بھی اُس کے شباب میں اتنی گرمی ہے کہ اُس پر پڑی ہوئی ہر نظر برف کی طرح پگھل جاتی ہے۔ یقیناً یہ عورت خوبصورت اور صحت مند بچوں کی ماں بن سکتی ہے اور بوڑھے کو کوئی حق نہیں کہ وہ قانونِ قدرت کی خلاف ورزی کرے۔ دھرتی انسانیت کے آرام کے لئے صحت مند اور توانا بچوں کی محتاج ہے وہ ہر خوبصورت لڑکی سے یہی توقع رکھتی ہے کہ وہ دھرتی کا دامن صحت مند بچوں سے بھر دے۔ مگر یہ بوڑھا دھرتی کی اُمیدوں پر ایک بھاری چٹان کی طرح آ بیٹھا ہے اُس نے اپنی مطلب پرستی کے دائرے میں ایک عورت کو قید کر رکھا ہے۔ اُس نے ایک موہوم اُمید کو زندہ رکھنے کے لئے ایک عورت کے حُسن اور شباب کو اپنی بوڑھی ایڑیوں تلے دبائے رکھا ہے۔ وہ باغی ہے۔ وہ ساری انسانیت کا مُجرم ہے۔ وہ قدرت کا گُنہگار ہے۔

اُسی وقت بوڑھا ملّاح آہستہ سے کمرے کا پردہ سرکا کر داخل ہُوا۔

"سلام صاحب! کل ہم نے بُرا بات کہا تھا حضور ہم کو رزّاق یاد آ گیا تھا" بوڑھے نے کہا

سیّاح نے دیکھا۔ بوڑھے ملّاح کا سارا بدن اُس کے میلے پیرہن کے نیچے تھر تھرا رہا ہے۔

"تم بڑا گُناہ کرتا ہے بڑے میاں" وہ بے تحاشا کہنے لگا

"گُناہ" بوڑھے نے حیرت میں پُوچھا

"ہاں تم نے ایک لڑکی کو قید کر رکھا ہے"

"قید کر رکھا ہے؟" بوڑھا ہنسنے لگا۔ "وہ ہمارا لڑکی ہے"

"وہ شادی کیوں نہیں کرتا؟"

"اُس کا شادی ہوا ہے"۔

"جھوٹ بولتا ہے۔ اُس کا ہسبنڈ مر گیا ہے۔ اور تُم بولتا ہے اُس کا شادی ہو چُکا ہے"

بوڑھا تڑپ اُٹھا۔ بولا "یہ مت بولو حضور، ہمارا لڑکا مرا نہیں زندہ ہے، وہ ضرور آئے گا"

"ہم بولتا ہے وہ نہیں آئے گا۔ دُنیا کو اچھے بچوں کی ضرورت ہے۔ اور تمہارا لڑکی اچھے بچوں کی ماں بن سکتا ہے"

"ہم کو بچہ نہیں چاہیئے۔ خُدا نے ہم کو بچہ دیا ہے"

"تُم کو نہیں چاہیئے مگر دُنیا بچہ مانگتی ہے"

"ہم کو دُنیا کی پرواہ نہیں۔ ہم کشمیری ہے۔ ہم دُنیا کے لئے اپنی عزت نہیں بیچتا۔ خبردار، جو ایسا بات ہم سے پھر کہا"

سیّاح بوڑھے کا جواب سُن کر ہکا بکا رہ گیا۔ اُس نے دیکھا۔ بوڑھا غُصّے سے کانپ رہا ہے۔ اُس کی داڑھی کا بال بال تھرا رہا ہے "ہم نے تم کو بوٹ میں اس لئے جگہ نہیں دیا کہ تم ہماری لڑکی کو بُری نظر سے دیکھو۔ ہم تم کو اپنا مہمان کہتا ہے اور تُم ایسا گندہ بات مُنہ سے نکالتا ہے"۔ یہ کہکر بوڑھا کانپتا ہُوا اپنے بوٹ کی طرف چلا گیا اور سیّاح کو محسوس ہُوا جیسے اُس کا سارا غرور ایک غلیظ بوڑھے نے پاش پاش کر دیا۔ وہ اپنے دونوں ہاتھوں سے مُنہ چُھپائے بیٹھا رہا، سوچتا رہا کہ میں نے ایسی کونسی بات کہہ دی جس سے بوڑھے ملّاح کے جذبات مجروح ہو گئے۔ کیا دُنیا اس قدر تنگ دامن ہو گئی ہے کہ اب یہاں نظریات کا اختلاف بھی نہیں سما سکتا۔

"حضور۔ چائے لے آؤں؟" نوکر نے پیچھے سے کہا

"ہمارا سامان باندھ لو۔ ہم واپس جائے گا" اُس نے جلدی سے کہا اور غسلخانے کی طرف بھاگا۔ اور نوکر حیرت سے منہ کھولے دیکھتا رہا۔

گوشۂ احباب

"... اللہ کرے کہ "گُل ریز" کی گُل افشانیوں سے تمام عالم مہک اُٹھے۔ جس شجر گلبار کی آبیاری آپ کے آبِ حیات ٹپکانے والے خامہ نے کی ہو اُس کی زندگیِ جاوید میں کیا شک ہے۔ خدا کرے کہ آپ کی سعی مشکور ہو اور یہ درخت پروان چڑھے ... "

رسا جاودانی

"کامل صاحب! ماہنامہ "گُل ریز" ایسے ادبی رسالہ کی ترتیب و اشاعت کے لئے واقعی آپ کی اور محترم عارف صاحب کی مساعی قابلِ مبارکباد ہے۔ "گل ریز" ادبی لحاظ سے ایک سبدِ گل ہے جس میں قسم قسم اور رنگ رنگ کے پھول آراستہ ہیں ... میری دعا ہے کہ خدا آپ جیسے ادب نوازانِ وطن کو تحفظ سرمایہ ادب، کشمیری زبان کو ترقی دینے اور علم و ادب کی صحیح خدمت کرنے کی توفیق دے۔ آمین! نیز التماس ہے کہ رسالہ کے سرورق کو زیادہ جاذبِ نظر بنانا چاہیئے۔[1] آیندہ اشاعت کے لئے نظم "رات" منسلک ہے ..... "

(مرزا کمال الدین شیدا سرینگر)

"مدتوں کے بعد یاد آوری کا شکریہ۔ "گل ریز" کی گل باریوں سے کشمیر کی حسین و جمیل وادی کی یاد پھر سے تازہ ہو گئی۔ اور شاید اب ہر مہینے جنتِ دید و فکر بن کر رہے گی۔ کشمیری علم و ادب کو ہندوستان کے اردو داں حلقے میں روشناس کرنے کی آپ نے جو یہ مہم شروع کر دی ہے یقیناً قابلِ ستائش ہے ... ... میں اس کی توسیع اشاعت کے لئے یہاں مقدور بھر کوشش کروں گا۔"

(حسین احمد رضوی بہار شریف)

"... ... اللہ کرے ریاست کی بساطِ ادب پر قدم رکھنے والا یہ حسین نو وارد اس رنگ سے پھول برسائے اور دل کی کلیاں کھلائے کہ ہر دیکھنے والی آنکھ کو اس کے ایک فردوسِ نظر جلوے سے وہ نور اور شادابی اور ہر دل و دماغ کو وہ خمار آگیں سرور و لذت حاصل ہو جائے کہ مجھ ایسے نادار لوگ بھی سعوبت کی انتہا لے کر خریداری کو جا دوڑنے پر مجبور ہو جائیں ... "

(تنہا انصاری بومبئی)

---

[1] سرورق کا ڈیزائن تیار ہو کر بلاک بنوانے کے لئے دہلی بھیجا گیا ہے۔ اگلے مہینے ملاحظہ کیجیئے گا۔ (امین کامل)

مدیر

لکھنے والے

پنڈت ناظر:- سری پرتاپ ہائی سکول سری نگر کے ہیڈ ماسٹر ہیں۔ کشمیر کی تاریخ، فلسفہ اور دوسرے علوم و فنون کا وسیع مطالعہ رکھتے ہیں۔ آج کی صحبت میں اس سمندر سے ایک قطرہ ہمیں بھی پلایا ہے۔ بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے۔

ابو ریاض:- ہمارے ادبی حلقے میں شاذ ہی کوئی ایسا ہوگا جو آپ سے روشناس نہیں۔ بعض مجبوریوں کی وجہ سے ابو ریاض کا یہ روپ دھار لیا ہے۔ اردو زبان کے ایک اچھے ادیب اور شاعر ہیں۔ ایک ایسے شاعر کہ اس دیس میں ان سا کوئی بھی اردو کا سخن ور ہو نہ سکا۔ تعلّی کہیے یا حقیقت۔

عبد الحق برق:- اپنی لحنِ داؤدی سے کشمیر بھر میں مشہور ہیں۔ اردو میں بھی شعر کہتے ہیں اور کشمیری میں بھی۔ ان کے سُریلے اور میٹھے الفاظ اور ان کا دِل نشین اور رس بھرا اندازِ بیان ان کی فن کاری کا بیّن ثبوت ہے۔

پریم ناتھ پردیسی:-

•

آپ کشمیر کے وہ مشہور افسانہ نگار ہیں جس نے کہ ہندوستان کے ادبی حلقے میں بھی نمایاں جگہ نکالی ہے۔ آپ کا یہ افسانہ ریڈیو سری نگر سے نشر ہو چکا ہے جہاں آپ خود بھی ملازم ہیں۔

فاضل کاشمیری:-

•

ایک ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر اور کہنہ مشق شاعر ہیں۔ کلام کے کئی حصے اب تک چھپ چکے ہیں۔ ان کی نظمیں اور غزلیں ان کی زندگی اور مقام کی خود ہی ترجمان ہیں۔

حامدی کاشمیری:-

•

ایم۔اے کے طالب علم ہیں۔ پچھلے دو تین سال سے شاعری کے میدان میں آئے ہیں اور اتنی تیزی سے آگے قدم بڑھا رہے ہیں کہ بڑوں کی صف میں جگہ پانے لگے ہیں۔ بہت ہی تابناک مستقبل رکھتے ہیں۔

افسر یزدانی:-

•

آپ یوں تو پنجابی ہیں لیکن مدت سے کشمیر میں ایسے رہتے آئے کہ اب ہمارے ہی ہو گئے ہیں۔ پچھلے دو ایک سال سے مشقِ سخن جاری ہے اور تیور بتا رہے ہیں کہ جلد ہی اپنی جگہ نکالیں گے۔

پروفیسر حاجنی:-

یوں تو عربی کے پروفیسر ہیں لیکن اردو، فارسی اور انگریزی علم و ادب پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔ آپ فردوسِ کشمیر کے خاندان کے ایک ممتاز فرد ہیں۔

(دوسرے فن کاروں کا تعارف اس سے پہلے کی اشاعت میں ہو چکا ہے)

بہرو کا پریس سری نگر میں بہ اہتمام محمد صدیق پرنٹر پبلشر کے چھپ کر دفتر "گل ریز" لال چوک امیرا کدل سے شائع ہوا۔